تذکرہ شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مفکر اسلام

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ

ترتیب و پیشکش

سید محمود حسن حسنی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول

رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ مطابق جون ۲۰۱۶ء

سید احمد شہید اکیڈمیؒ

دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

نام کتاب : تذکرہ شیخ الاسلام
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

مصنف : مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ترتیب و پیش کش : سید محمود حسن حسنی ندوی

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰

صفحات : ۱۶۰

کمپوزنگ : عرفات کمپیوٹر سینٹر (محمد ارمغان بدایونی ندوی)

قیمت : Rs.100/-

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء،

☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنو

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ لکھنو

باہتمام: محمد نفیس خان ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

عرض ناشر ۹
مقدمہ از حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ۱۱
تقریظ از جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ ۱۶
عرض مرتب ۲۴
مولانا حسین احمد فیض آبادیؒ از مولانا سید عبدالحی حسنیؒ ۲۶

باب اول

شخصیت کے تشکیلی عناصر اور علمی و روحانی سلسلے

ولی اللہی درسگاہ سے انتساب اور اجازت حدیث ۳۵
دارالعلوم دیوبند ۳۷
دارالعلوم دیوبند کا پیغام اور امتیاز ۴۰
سلسلہ قادریہ راشدیہ اور اس میں اجازت وخلافت ۴۰
سلسلہ چشتیہ اور اس سے انتساب ۴۴
سلسلہ احسنیہ (آدمیہ مجددیہ نقشبندیہ) سے انتساب و اجازت ۴۶

حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقہ وسلسلہ سے وابستگی ۴۹
حضرت سید صاحبؒ کی طرف مشائخ وعلماء کا رجوع ۵۱
شیخ ومرشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۵۲
استاد ومربی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ۵۵

باب دوم

جامعیت، علمی رسوخ، تعلیم وارشاد اور قائدانہ کردار

پہلا تعارف ۵۸
برادر معظم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کا تعلق ۵۹
مولانا کی خدمت میں میری حاضری اور دیوبند کا قیام ۶۱
ایک بڑا فائدہ اور برکت ۶۳
دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی اور جائس ونصیر آباد کا ایک سفر اور میری رفاقت ۶۴
ایک ہنگامہ خیز دور ۶۵
۱۹۴۷ء کا انقلاب ۶۷
دینی حمیت وغیرت اور جرأت وعزیمت ۶۸
جامعیت اور علمی رسوخ ۷۰
مسلسل جدوجہد اور سرتاپا قربانی زندگی ۷۱
علمی مذاق اور رہنمایانہ کردار ۷۲
اتاترک کے بارے میں حقیقت حال کا اظہار اور مولانا مدنیؒ کی حق پسندی ۷۴

باب سوم

انسانی واخلاقی بلندی اور استقامت وشجاعت

انسانی حقیقت وشخصیت ۷۶
حقیقی آدمی ۷۷
انسانی پستی ۷۹
انسانی بلندی کے معیار ۸۰
حضرت مدنیؒ کا مقام ۸۵
اخلاقی بلندی اور شخصیت کی دلآویزی ۸۸
عالی حوصلگی اور وسیع الظرفی ۹۱
انکار نفس اور تواضع ۹۲
اخلاق وانسانیت کا خسارہ ۹۳

باب چہارم

اوصاف وخصوصیات، امتیازات وکمالات

مجددانہ عزیمت وبصیرت ۹۴
مجاہدہ واستقامت ۹۵
عفوودرگزر ۹۶
حق پسندی ۹۷
خوردنوازی ۹۸
علمی کاموں میں تعاون ۹۹

سرمایہ ملت اور ملی تشخص کے تحفظ کی کوشش ۹۹
ذکر ۱۰۰
رمضان کا اہتمام ۱۰۰

باب پنجم

مجاہدانہ کارنامے

الفاظ و اوصاف کا درجہ حرارت ۱۰۲
حمیت و عزیمت کا استعمال ۱۰۳
جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار ۱۰۶
خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ ۱۰۹
انقلاب انگیز تبدیلیاں ۱۱۲
تاریخی المیہ ۱۱۳
تحریک خلافت کا مظہر اتم ۱۱۴
برطانیہ کی سرپرستی ۱۱۶
اظہارِ حقیقت ۱۱۷
امت اسلامیہ دوراہے پر ۱۱۸

باب ششم

عظیم قائد اور عظیم مرشد و مربی

سب سے نایاب اور مشکل کام ۱۲۰
جنگ آزادی کے عظیم قائد اور عظیم دینی رہنما ۱۲۰

شخصیت کے کچھ پوشیدہ گوشے ۱۲۱
اخلاص وللہیت ۱۲۲
عالی حوصلگی اور عزیمت ۱۲۵
دینی انہماک و دینی مصروفیت میں صاحب کرامات شخصیت ۱۲۶
نسخۂ آدمیت ۱۲۷
وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل ۱۲۸
عصمت، انبیاء کے ساتھ خاص ہے ۱۲۹
جذبہ تشکر اور حمیت دینی ۱۲۹
عزم واستقلال اور ثبات واستقامت ۱۳۰
فیوض وبرکات کا لامتناہی سلسلہ ۱۳۱
ملی احساسات اور درد وسوز ۱۳۱
آخری ایام ۱۳۲
بشاشت اور خوش مزاجی ۱۳۳
امت محمدی سے تعلق ۱۳۳

باب ہفتم

معاصر علماء ومشائخ کا تعلق، عقیدت واحترام اور ممتاز اصحاب علم وفضل کا تعلق بیعت وارادت

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ۱۳۴
مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ۱۳۵

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ ۱۳۵

مولانا احمد علی لاہوریؒ ۱۳۶

مولانا ابوالکلام آزادؒ ۱۳۶

مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوتؒ ۱۳۷

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ ۱۳۹

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ ۱۴۰

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ ۱۴۲

مولانا شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالیؒ ۱۴۶

مولانا سید طلحہ حسنیؒ ۱۴۶

ممتاز اصحاب علم و فضل کا تعلق بیعت وارادت

مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ... ۱۴۸

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ ۱۵۰

مولانا نسیم احمد فریدی امروہویؒ ۱۵۱

ضمیمہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

سوانحی خاکہ از: حضرت شاہ سید نفیس الحسینی صاحب علیہ الرحمہ ۱۵۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ان اصحاب عزیمت بزرگوں میں سے تھے جن کی زندگی علماء متقدمین کا نمونہ تھی، جس طرح جام شریعت اور سندان عشق کو انہوں نے جمع کیا اسی طرح علم ودعوت کا ایسا دوآتشہ انہوں نے تیار کیا جس نے نہ جانے کتنے دلوں کو گرم کیا، تحقیق وتدریس کے ساتھ ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت کا جو کام انہوں نے انجام دیا، وہ اسلامیان ہند کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے اور اس راستہ میں جس قربانی ومجاہدہ اور انتہائی عزیمت کی راہ انہوں نے اپنائی وہ ایک مثال ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے اہل ندوہ کا گہرا تعلق رہا ہے، مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا تعلق بیعت حضرت مدنی سے ہی قائم ہوا، اور راقم سطور کے دادا مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت مدنی سے ہی بیعت کی، ان کے علاوہ گھر کے متعدد افراد تھے جن کا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے گہرا تعلق تھا، حضرت جب بھی لکھنؤ تشریف لاتے تو ڈاکٹر صاحب کے گھر ہی میں قیام فرماتے، یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے فرزند اور راقم کے والد ماجد مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مدنی کی سوانح قلمبند کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، جو اس سے پہلے حضرت شاہ علم اللہ حسنی اور حضرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کی سوانح مرتب کر چکے تھے، لیکن یہ کام بالکل ابتدائی شکل ہی میں تھا کہ وہ مختصر علالت کے بعد

صرف چوالیس سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس گنہگار کے لیے کئی حیثیتوں سے یہ سعادت کی بات ہے کہ تذکرۂ مدنی کے نام سے یہ کتاب قارئین کے سامنے ہے، ایک تو یہ ایک عظیم مجاہد اور صاحب عزیمت شخصیت کی سوانح ہے، دوسرے یہ کہ یہ اہل خاندان کے شیخ کا تذکرہ ہے، اور تیسرے یہ کہ والد صاحب جو کام مکمل نہیں کر سکے اس کی تکمیل ہو رہی ہے۔

یہ حقیقت میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے حضرت مدنی سے متعلق تحریر فرمائے، جن کو خواہر زادۂ عزیز مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ اللہ نے بڑی عرق ریزی سے جمع کیا، حضرت کی تحریروں میں جہاں کہیں بھی انہیں حضرت مدنی کا تذکرہ مل گیا انہوں نے بڑے سلیقہ سے اس کو کتاب کا جز بنا دیا، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو قبول فرمائے اور برکت عطا فرمائے، کتاب کے آغاز میں عم مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور عم معظم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ کے مقدمات بجائے خود بہت مفید و معلومات افزا تاثراتی مضامین ہیں، اس طرح یہ مفید مجموعہ ناظرین کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور مفید تر بنائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

بروز پنج شنبہ، ۲۰/ رجب المرجب ۱۴۳۷ھ

مرکز الامام أبي الحسن الندوي

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم
(ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین
وخاتم النبیین، سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد!

برصغیر ہند و پاک عالم اسلامی کا ایک وسیع اور اہم خصوصیات کا حامل حصہ ہے، یہاں کے مسلمانوں میں بڑی عظیم المرتبت بلکہ تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں اور بعض بعض نے اس سے وسیع تر دائرہ میں حالات پر اثر ڈالا، اس خطۂ ارضی پر مسلمانوں کی طویل حکومت کے بعد گذشتہ دو صدیوں میں سامراجی اقتدار نے اپنے قدم جما لیے تھے، اور اس کے اثر سے حالات کا رخ اسلام اور مسلمانوں کے لیے نہایت تاریک ترین ہوگیا تھا، اس اقتدار کو ختم کرنے اور بہتر بنانے کے لیے جن علمائے عظام نے اپنی فکر و کوشش صرف کی اور حالات پر اثر ڈالا ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شخصیت کا نمایاں حصہ رہا، یہ وہ عظیم ترین شخصیت تھی جو گذشتہ صدی کے عظیم المرتبت علماء میں تھے، اور علمی و دینی اور عملی حیثیت سے جامع شخصیت تھے، ایک طرف علوم دینیہ خاص طور پر حدیث شریف میں دوسری طرف دینی لحاظ سے تقوی و ورع اور تربیت و ارشاد کا عظیم مرتبہ رکھتے تھے،

اور تیسری طرف ملت اسلامیہ کے قومی و وطنی مفادات کی فکر کرنے والے اور اس کے لیے اپنی راحت و سہولت کو قربان کر دینے والے تھے، ان کی پیدائش مشرقی یوپی ضلع فیض آباد میں ہوئی، اور نشو ونما کا ابتدائی وقت وہیں گذرا، ان کے والد بزرگوار مولانا سید حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرآدابادی سے استرشاد کا تعلق رکھتے تھے، وہ اور ان کا خاندان کئی صدیوں سے ٹانڈہ کی بستی میں متوطن تھا، یہ خاندان سادات حسینیہ کی شاخ تھا، اور اندازاً آج سے چار پانچ سو سال پہلے ہندوستان آیا تھا، اس کے مورث مولانا شاہ نورالحق اپنے وقت کے بڑے بزرگ گذرے ہیں، ان کے بعد بھی خاندان میں بزرگی کا سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔

حضرت مولانا کے والد بزرگوار حالات کے تقاضے سے یہاں سے حجاز منتقل ہوگئے تھے، چنانچہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب دارالعلوم دیوبند تعلیم حاصل کرنے سے فراغت پر وہیں منتقل ہوگئے، اور مدینہ منورہ میں قیام ہوا، وہاں درس و تدریس کا بھی مشغلہ رہا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی تعلیم کے زمانہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی جو شاگردی اور روحانی تربیت حاصل ہوئی تھی اس کی بناء پر ان سے براہ راست ربط قائم رہا، اور ان کی سیاسی جدوجہد میں جو برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے تھی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی بحیثیت معاون شریک رہے، اور اس عمل کو رضائے الٰہی کی طلب کے ساتھ انجام دینے لگے، اور اس عمل میں وہ اپنے استاذ و مرشد کے ساتھ شریک اور ایسے وابستہ رہے کہ ان کے بعد سیاسی جدوجہد کے زمانہ میں جو انگریزی سامراج کے خلاف تھی انگریزوں نے ان کو اپنے مرشد اور بعض رفقاء کے ساتھ کئی سال مالٹا میں قید رکھا، وہ اپنے شیخ کے ساتھ رہے، اور ان کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھاتے رہے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جو کہ دارالعلوم دیوبند کے سربراہ و سرپرست تھے، اور اپنے زمانہ کے بڑے مرشد اور عظیم المرتبت عالم دین تھے، ان سے بھی استفادہ کا تعلق

رکھا، اوران کا اعتماد بھی حاصل کیا، حضرت مولانا گنگوہیؒ ان کے استاد و شیخ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ کے بھی مربی و شیخ تھے، ان کے علاوہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور خواص وعوام کا ان کی طرف رجوع تھا سے بھی مکہ معظمہ میں قیام کے دوران ارشاد دینی کا فائدہ حاصل کیا، اور پھر دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے دارالعلوم دیوبند سے مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل منتقل ہو جانے پر ان کی جگہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور اس کے ساتھ پوری زندگی حدیث شریف کی تعلیم اور ملک کو سامراجی طاقت سے آزاد کرانے اور مسترشدین کی تربیت اور ارشاد کے کام میں گذاردی اور جس اخلاص اور رضائے الٰہی کی طلب کے ساتھ یہ سب کام انجام دیئے ان کی بناء پر مسلمانان ہند کے دلوں پر اور علوم دینیہ کی خدمت کرنے والوں کے درمیان بڑی عزت اور عظمت کا مقام حاصل کیا، اور آزادیٔ وطن کے لیے جو جدوجہد کی اور اس کے لیے بار بار جیل جانا ہوا، جیل کی تکلیفیں برداشت کیں، اس میں جہاد کی نیت اور جہاد ہی کا جذبہ کارفرما تھا، جس کی قدر سب صالح اور ربانی نفوس کے دلوں میں رہی، اور خود ان کے منتسبین اور مسترشدین کی ایک تعداد کو بڑا فائدہ پہنچا، اور ملت اسلامیہ کی قومی مشکلات میں بڑے سہارا بنے، اور چونکہ تعلیم سے فراغت پر مدنی نسبت ان کے نام کے ساتھ وابستہ ہوگئی تھی اور اس نسبت کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا تھا، ان کو اگرچہ برصغیر کی ملی و دینی ضرورت کے لیے ہندوستان آنا پڑا لیکن وہاں کے قیام کے اثرات اور اس کی نسبت کے برکات ان کو حاصل رہے، اور اپنی مختلف ملی جدوجہد اور ارشاد و تربیت کی خوبیوں کی وجہ سے ''شیخ الاسلام'' کا خطاب ان کو قدردانوں کی طرف سے ملا، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ علوم دینیہ میں بلند پایہ رکھنے کے ساتھ ساتھ تقوی اور ربانیت اور اتباع سنت اور جذبہ جہاد کی ایسی خوبیوں کے حامل تھے کہ ان کو

جو بھی دیکھتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کی محبت اپنے دل میں محسوس کرتا، اور ان کو ملت کا بیش بہا قائد تصور کرتا، ان کی ذات برصغیر کی ملت اسلامیہ کے لیے بہت اثر پذیر اور دلوں کی تقویت کا باعث رہی، چنانچہ ان کی وفات پر بڑا خسارہ اور خلاء محسوس کیا گیا، ان کی شخصیت ایسی شخصیت تھی کہ نئی نسلوں کے سامنے جو خصوصیات اور کارنامے سامنے لانے کی ضرورت ہے، خود ان کی کتاب ''نقش حیات'' سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور بھی کتابیں لکھی گئیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے خاص ربط تھا اور عقیدت تھی، اور دیوبند جا کر کئی ماہ انہیں کے یہاں قیام رہا، ان کے درس حدیث سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملا تھا، چنانچہ مولانا نے ان کے بارے میں مختلف حیثیتوں سے جو اظہار کیا ہے اس سے بھی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شخصیت پر اچھی روشنی پڑتی ہے، برادر زادۂ عزیز مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی اس سلسلہ کی مختلف تحریروں کو یکجا کر کے شائع کرنے کی ضرورت محسوس کی، ان کی نگرانی میں عزیزی مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی نے اس کو بڑے اچھے انداز میں بعض دیگر متعلقات کے ساتھ تیار کر دیا، اور اشاعت سے پہلے مجھ سے مقدمہ کی فرمائش کی۔

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ کو میں نے بار بار دیکھا اور ان کی خدمت میں بار بار حاضری کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اور میرے دل میں بھی دیگر معتقدین کی طرح ان کی بڑی عظمت ہے۔

جیسا کہ گذشتہ سطروں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ان کی شخصیت ایک عظیم دینی مربی و روحانی مرشد اور اس کے ساتھ ایک عظیم قائد اور ملی رہنما اور پھر ممتاز عالم و معلم دین اور داعی کی بھی تھی، اور ان کی ان تینوں حیثیتوں کو مجھے قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا شرف حاصل ہوا، اس لیے کہ میرے خاندان کے اکثر لوگ میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب مرحوم، اور نانی صاحبہ (والدہ مولانا سید

ابوالحسن علی ندوی) اور خالہ صاحبہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ وغیرہ اور دوسرے حضرات کا ان سے بیعت واصلاح کا تعلق تھا، اور لکھنؤ میں ان کا قیام میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب مرحوم کے مکان پر ہوا کرتا تھا، اور ہم لوگوں کو خدمت کی سعادت حاصل ہوتی تھی، دن میں لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات میں ان کی دینی پختگی اور رات کی تنہائیوں میں ان کے تعلق مع اللہ، آہ سحر گاہی، دعائے نیم شبی، سوز و گداز، الحاح وتضرع کو قریب سے دیکھا، اور پھر جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کررہا تھا اور ملک کی تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی، دارالحدیث ان کے درس حدیث سے گونج رہا تھا، اگر چہ میں اس درجہ میں نہیں تھا، اس درجہ کی تیاری کے درجہ میں تھا اور پھر تقسیم کے بعد ملک کے حالات بگڑ جانے کی وجہ سے دوبارہ دیوبند حاضر نہیں ہوسکا، لیکن اس میں بھی ان کے مقام بلند کا ایک اندازہ ہو چکا تھا، اور ان کے قائدانہ مقام و کردار اور اس میں ان کی بصیرت وفراست اور تحمل وعزیمت اور بے لوث خدمت کا جہاں ان کے رفقائے جہاد حریت کو احساس واعتراف تھا دوسرے بھی ان کے اس امتیاز کو سمجھتے اور جانتے تھے، اور ملک کی تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں ان کی صدارت میں لکھنؤ میں بڑا اجلاس منعقد ہوا تھا، اوقت ہم لوگ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری درجات میں تھے، وہ مسلمانوں میں حوصلہ بلند کرنے اور نئے حالات میں ان کو لائحہ عمل دیتے تھے، بڑا مفید اجلاس تھا، پیش نظر کتاب ان کی ان تینوں حیثیتوں کو پیش کرتی ہے، جو یقیناً ایک رہنما کتاب ثابت ہوگی، اور مختلف میدان عمل میں کام کرنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لہٰذا ان کے سلسلہ میں مقدمہ لکھنے کو میں اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں، جس کی تعمیل ان چند سطروں کے ذریعہ کررہا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین.

محمد رابع حسنی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ حسنی تکیہ کلاں
رائے بریلی

سنیچر ۲۷/ رجب ۱۴۳۷ھ
۷/ مئی ۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى أما بعد!

ہندوستان میں انگریزی سامراج کا زمانہ خصوصاً مسلمانوں کے اعتبار سے ظلم واستبداد کا زمانہ کہا جائے گا، امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد ان سے تعلق اور انتساب رکھنے والوں کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، ۱۸۵۷ء کے واقعہ شاملی کے بعد بہت سے اصحاب درس وتصنیف، علماء اور اصحاب ارشاد و تربیت مشائخ نے ملک سے ہجرت بھی کی اور حرمین شریفین میں قیام اختیار کیا، ان میں حضرت شاہ محمد اسحاق، حضرت شاہ محمد یعقوب دہلوی، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی، علامہ رحمت اللہ کیرانوی مصنف ''اظہار الحق'' و بانی ''مدرسہ صولتیہ'' مکہ مکرمہ اور شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی جیسی نادرہ روزگار شخصیات ہیں۔

ہجرت کا یہ سلسلہ جاری رہا، کچھ علماء کو ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کی فکر دامن گیر ہوئی، ان کی تعلیم و تربیت اور دین کی بقا کے انتظامات پر غور کیا تو ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ دین کی بقا کا سب سے بڑا ذریعہ علوم دینیہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح کے وسائل کی فکر ہے، چنانچہ ہندوستان میں دینی مدارس کے قیام کی فکر و کوشش کی گئی اور ہندوستان میں تعلیم و تربیت کے مراکز کا قیام

بھی عمل میں آنے لگا، نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کے تحفظ اور علماء و مصلحین کے تیار کرنے کا عمل ایک ضروری کام تھا، یہ فکر وکوشش مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند اور ان کے رفیق درس وارادت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا سعادت علی سہارنپوری بانی مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ان کے علاوہ مولانا کرامت علی جونپوری کے بنگال وآسام میں دعوتی دوروں اور مولانا سید جعفر علی نقوی کے مشرقی ہندوستان اور نیپال کے خطہ میں دعوتی واصلاحی دوروں کے ذریعہ دین کے استحکام اور نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کے تحفظ کی کوششیں جاری تھیں، ان اداروں سے علماء اور اصحاب درس وافادہ تیار ہو رہے تھے۔

دینی مراکز تعلیم وتربیت میں ایک مدرسہ وخانقاہ گنج مراد آباد کانپور میں حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کی قائم تھی، اور دور دور سے لوگ اس مدرسہ وخانقاہ میں آتے تھے، جو ایک طرف مسند الہند حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے مدرسہ کی شاخ اور دوسری طرف مجددی تربیت گاہ کا فیض تھی، اسی مدرسہ تعلیم وتربیت سے فیض یافتہ شخصیات میں ایک شخصیت مولانا سید حبیب اللہ فیض آبادی کی تھی، انہوں نے بھی اپنے اہل خانہ کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کی، جس طرح مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ کی بنیاد پڑی اسی طرح مدینہ طیبہ میں مدرسہ علوم شرعیہ کی بنیاد آپ اور آپ کے صاحبزادگان کے ذریعہ پڑی، انہی میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ بھی تھے جن کے مجاہدہ وعزیمت کا حال یہ تھا کہ وہ مسجد نبوی میں ۱۴-۱۴ گھنٹے درس دیتے تھے، اور دودھ و کھجور پر قناعت کرتے، ان کے درس سے جو حدیث شریف کا درس تھا استفادہ کرکے حج وعمرہ میں آنے والے مختلف ملکوں کے لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دین کے لئے قربانیاں دیں اور سامراج کے خلاف جہاد میں حصہ لیا، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

لیکن حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان واپس آنا پڑا اور

تحریک خلافت جو "تحریک ریشمی رومال" سے متعارف تھی اس میں انہوں نے اپنے استاد و مربی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے ایک جان نثار خادم کے طور پر پورا حصہ لیا اور ان کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث بھی سنبھالی جب وہاں کے شیخ الحدیث علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بعض مصلحتوں سے دیوبند سے ڈابھیل (گجرات) کے مدرسہ تعلیم الدین منتقل ہوگئے تھے۔

مالٹا میں قید کے وقت جب انگریز بدسلوکی کرتے تو وہ صبر و تحمل کا سہارا لیتے تھے، حضرت شیخ الہند کی مالٹا کے اسارت کا حال انہی کے شاگرد جو بعد میں ان کے جانشیں کے طور پر متعارف ہوئے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے "نقش حیات" میں لکھا ہے کہ:

"مالٹا نہایت سرد جگہ ہے، ہم کو ابتدا میں خیموں میں رکھا گیا، سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی تھی، مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کی باوجود یہ کہ لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدہ اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے، پھر بھی آدھی رات کے بعد سردی کی شدت سے نیند نہیں آتی تھی، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے، پیشاب وغیرہ سے فارغ ہوکر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور چوں کہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی ایک شب میں کئی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی، تاہم بلا تکلف بار بار وضو کرتے تھے، اگرچہ بعد میں ہم گرم پانی اور آگ کے مہیا کرنے کا انتظام بھی کرسکے، تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہوسکا تھا، تب بھی بلا تکلف حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے اعمال بجالاتے رہے"۔

انہی عہد میں ایک رمضان میں قرآن مجید سنانے والا کوئی حافظ نہیں ملا تو حضرت

نے فیصلہ کرلیا کہ وہ روزآنہ ایک پارہ یاد کریں گے اور روزآنہ رات کو تراویح میں سنائیں گے، اس طرح انہوں نے جیل میں بھی حضرت شیخ الہند کی بڑی خدمت کی، حضرت شیخ الھند سے ان کو بڑی عقیدت اور محبت تھی، اس کا اندازہ حضرت کے خطوط سے ہوتا ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے اپنی پوری توانائی جن محاذوں پر لگائی ان میں ایک درس وتدریس کا محاذ ہے، جس کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قیام رہا، اوران کے اس درس حدیث سے جو ولی اللہی درس حدیث کا امتداد تھا اوراس کے وہ اپنے دور میں مرجع ومرکز بن گئے تھے، بڑے بڑے علماء نکلے اور خال مخدوم ومعظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی چند ماہ ان کے درس حدیث سے استفادہ کے لئے دارالعلوم کا قیام اختیار کیا اوران کی توجہات لیں۔

دوسری طرف مولانا سید حسین احمد مدنی نے ملک کی برطانوی سامراج سے آزادی کے لئے کوششوں میں پوری قوت سے حصہ لیا اور جب جمعیۃ علماء ہند کی قیادت ان کے حصہ میں آئی تو کانگریس کے ساتھ مل کر انہوں نے بڑے بڑے پروگرام منعقد کئے، اور یہ ان کی اعلی درجہ کی قابلیت تھی کہ انہوں نے درس وتدریس کو اپنی ان سرگرمیوں سے متاثر نہیں ہونے دیا اور یہ ان کا اعلی درجہ کا اخلاص تھا کہ ملک کو برطانوی سامراج سے آزاد کرانے کے بعد انہوں نے اس کا مادی صلہ قبول نہیں کیا، نہ ہی وزارت وحکومت میں حصہ دار بنے اور نہ کوئی ایوارڈ وغیرہ قبول کیا جو ملک کی اعلی شخصیت کے طور پر ان کو ملنے جارہا تھا۔

مجھے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو اپنی طالب علمی کے زمانہ سے اور بعد میں بھی قریب سے دیکھنے اور دیوبند میں استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی، تحریک آزادی کے دوران حضرت کا لکھنو کا سفر ہوتا اور میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے مکان پر قیام ہوتا، تو ہمیں حاضری کا موقع اوران کی مجلسوں میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، اور دوران

قیام استفادہ کا بھی موقع ملتا اور حضرت کی تقریریں ہوتیں تو ان کے سننے کا بھی موقع ملتا، حضرت کے بیان میں انگریزوں کے مظالم خاص طور سے مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں کا ذکر ہوتا، اکثر وہ ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب سے مسلمانوں کے تعلق سے اقتباسات سناتے اور مسلمان، اسلام، مسلم دشمنی اور سامراجی منصوبوں سے آگاہ کرتے اور ہندوستان اور عالم اسلام کے خلاف ان کی سازشوں اور جبر وقہر کے سلوک کا ذکر کرتے اور مسلمانوں کی پسماندگی کا ان کو اصل سبب قرار دیتے۔

خطہ بنگال وآسام میں رمضان گزارنے کا طویل عرصہ معمول رہا اور اپنے وطن ٹانڈا فیض آباد میں اور آخر میں دارالعلوم دیوبند میں قیام رہا، اور وہاں اہل تعلق حاضر ہوکر استفادہ کرتے، رمضان میں ان کے معمولات ایسے ہوتے جو ہر شخص کی برداشت کے باہر ہوتے، رات کا زیادہ وقت تلاوت، نماز اور ذکر ودعا وغیرہ میں گزارتے اور بہت مجاہدے کرتے اور تدریس کے ساتھ ان کی مصروفیات میں کوئی فرق نہ آتا، صبر وتحمل اور تواضع میں ان کی مثال ملنا مشکل ہے، اپنے کو ہمیشہ دوسروں کے مقابلہ میں کمتر سمجھتے اور اپنے خطوط میں آخر میں اپنے لیے ننگ اسلاف لکھتے جبکہ حقیقت میں وہ اسلاف ہی کا نمونہ اور یادگار سلف تھے اور اپنے عصر کے سبھی مشائخ اور علماء کی نظر میں ان کا اعلیٰ مقام تھا۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے اپنی ''آپ بیتی'' میں حضرت کی آمد کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ جس سے ان کے بارے میں ادب واکرام کا اندازہ ہوتا ہے، اور ان کی آمد پر بڑی مسرت وخوشی کا والہانہ انداز سے ذکر کیا ہے، اسی لیے حضرت سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص حضرت شیخ کے پاس آتا تھا تو اس کا بھی اکرام فرماتے تھے، یہی حال حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری کا بھی تھا، حضرت کی شخصیت بہت بارعب تھی، ملاقات وزیارت میں جس کی نظر پڑتی وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور جس پر ان کی نظر پڑتی اس کی زندگی

متاثر ہوجاتی تھی۔

ہمارے خاندان کے متعدد افراد وخواتین حضرت سے بیعت واسترشاد کا تعلق رکھتے تھے، جس میں خاص طور پر حضرت مولانا عبد الحی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے معاون خاص مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی (والد ماجد مولانا سید ابوبکر حسنی) اور برادر محترم سید مسلم حسنی (دادا عزیزی مولوی محمود حسنی ندوی سلمہ) اور ہماری نانی صاحبہ والدہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور خالہ صاحبہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ جنہوں نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان سے تجدید بیعت کی تھی، قابل ذکر ہیں۔

حضرت مدنی کو اپنے سیاسی موقف کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک گروپ کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ اپنے موقف پر اخیر تک قائم رہے۔ سفر میں بعض سیاسی مخالفین کی طرف سے سخت اہانت آمیز رویہ اختیار کیا گیا، لیکن حضرت نے ثبات اور صبر وتحمل کا ثبوت دیا اور اس کا کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔

آزادی کے بعد دیوبند کئی بار حاضری ہوئی، وہاں دیکھا کہ حضرت سب مہمانوں کے ساتھ بغیر کسی تفریق کے سب کے ساتھ حسن سلوک اور محبت کا معاملہ فرماتے۔

مولانا کا معمول تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ حسن سلوک فرماتے اور یہ اس لیے کرتے تاکہ وہ قریب آئیں اور مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں اچھا تاثر قائم ہو، ٹرین میں مسافروں اور عملہ کے ساتھ گھل جاتے، خصوصی معاملہ فرماتے اور ان کی تربیت کرتے، بعض وقت خدمت اور صفائی وغیرہ کی ضرورت پڑتی تو خود ہی پیش قدمی کرتے۔

دہلی میں جمعیۃ العلماء کے اجتماعات کے موقع پر دفتر جمعیۃ میں جب حضرت کی آمد ہوتی، تو حاضری کا موقع ملتا اور دوسرے علماء اور مسلم قائدین کا اجتماع ہوتا، تو علمی

،دینی اور وطنی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا، حضرت کی مجلس بڑی باوقار ہوتی، کبھی کبھی مولانا ابوالکلام آزاد بھی تشریف لاتے، تو یہ مجلس اور وسیع ہوجاتی۔

سیاسی مصروفیت کے باوجود ان کے اپنے معمول میں کوئی فرق نہ آیا، سفر سے واپسی کے فورا بعد درس حدیث میں مشغول ہوجاتے اور پورے استغناء اور کرم وسخاوت کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، دسترخوان ان کا ہمیشہ بہت وسیع رہا، سفر حج کے لیے جب روانہ ہورہے تھے تو اس وقت اس ناچیز کو خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ حاضری کا موقع ملا، اس وقت عوام وخواص کا بڑا ہجوم تھا اور عجیب منظر تھا جو بھلایا نہیں جاسکتا، خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ انہیں اپنے عہد وعصر کی سب سے بڑی شخصیت قرار دیتے تھے، حجاز مقدس میں ان کے قیام اور درس وافادہ اور برصغیر میں دعوتی واصلاحی دوروں اور افادہ عام کے باعث انہیں شیخ العرب والعجم بھی کہا گیا۔

عزیزی مولوی محمود حسن حسنی ندوی سلمہ نے حضرت کے بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے تاثرات اور مضامین ومقالات کو جو مختلف موقع ومناسبت پر بعض مجلّات کے لیے لکھے گئے ان کو جمع کرنے کا کام کیا اور بعض مقامات پر توضیحی نوٹ بھی لگائے ان کی خواہش پر یہ سطریں تحریر کی گئیں۔

اس دور میں جبکہ جنگ آزادی میں اور مسلمانوں کی ملی خدمات کے سلسلہ میں جن بزرگوں نے قربانیاں دیں، ان کو لوگ بھولتے جارہے ہیں، اس کی ضرورت ہے کہ ان بزرگوں کا تذکرہ کیا جائے، اس وقت پھر حالات مسلمانوں کے اعتبار سے سابق سامراجی ملکوں کی سازشوں کے نتیجہ میں فکرمندی کا باعث بن رہے ہیں، ان شخصیات کا ذکر بہت ضروری ہے، جنہوں نے سامراج کے مقابلہ میں قائدانہ رول ادا کیا ہے۔

ہم عزیزی مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شخصیت اور خدمات پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے لکھے گئے کئی مقالات کو مرتب کرکے ایک دستاویز تیار کردی، اللہ تعالی اسے نافع بنائے اور قبول فرمائے (آمین)۔

محمد واضح رشید حسنی ندوی
(دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو)

۱۴/جمادی الآخرۃ ۱۴۳۷ھ
۲۴/مارچ/۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد!

پیش نظر کتاب ''تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ'' در اصل ان مضامین ومقالات اور خطابات کا مجموعہ ہے جو مختلف مناسبت سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کے سامنے آئے، ''مکاتیب شیخ الاسلام'' پر اس کے مرتب حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ لکھوایا تھا، جو اس کی دوسری جلد میں شامل کیا گیا ہے، اور حضرت مولانا قدس سرہ پر مولانا فرید الوحیدی علیہ الرحمہ کی مبسوط کتاب پر تفصیلی مقدمہ اور حضرت شیخ الاسلام پر ایک سیمینار کے مقالات کا مجموعہ جو مولانا ڈاکٹر رشید الوحیدی صاحب کا مرتب کردہ ہے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کا ایک تعزیتی خطاب جو ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ میں شائع ہوا تھا، اور نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا تذکرہ جو اس کے مصنف حضرت مولانا عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے قلم سے تھا، جس کی اشاعت کے وقت اس کی تکمیل حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے کی تھی، جس کا ترجمہ برادرم مولوی محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاد دار العلوم ندوۃ العلماء) نے کیا ہے، اور ''پرانے چراغ'' و ''سوانح حضرت رائے پوری''، و ''حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت'' اور ''سوانح حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی'' اور حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کی بعض دوسری تحریروں سے جو مواد دستیاب ہوا، اس کو ان کے حوالوں کے ساتھ پیش

کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے، جس کے لیے اپنے احباب مولوی محمد نفیس خاں ندوی، مولوی محمد ارمغان ندوی بدایونی اور مولوی سید محمد مکی حسنی ندوی کہ کتاب کا ٹائٹل ان کے ذوق کا شاہکار ہے کا راقم بہت ممنون و مشکور ہے، اول الذکر دونوں احباب کا اس لیے کہ انہوں نے کمپوزنگ اور ترتیب کے مراحل میں بڑا تعاون دیا، مخدوم گرامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مخدوم گرامی حضرت حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی کی تقریظات اور خال محترم مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کا عرض ناشر یہ اس مجموعۂ مضامین و افادات کو زینت و اعتبار بخشتا ہے، اس عظیم و عبقری و تاریخ ساز اور اپنے عہد کی سب سے بڑی شخصیت کے متعلق کہنے اور لکھنے کو جی تو بہت چاہتا ہے، لیکن اکابر کی تقریظات اور تحریروں کے بعد مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں، سوانحی خاکہ کے طور پر مربی جلیل حضرت سید انور حسین زیدی شاہ نفیس الحسینی لاہوری نور اللہ مرقدہ کا مضمون ''الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر، دہلی'' سے ماخوذ اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا باعث مضمون ہے جو شامل اشاعت ہے۔

سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی اسے شائع کررہا ہے، واضح رہے کہ صاحب تذکرہ حضرت سید احمد شہید قدس سرہ سے نہ صرف بڑی عقیدت اور والہانہ محبت و شیفتگی رکھتے تھے، بلکہ ان کے مشن کو آگے بڑھانے والی شخصیت اور ان کے جہاد و عزیمت کو زندہ رکھنے والی ہستی اور سلوک و عرفان، ارشاد و تربیت میں ان کے سلسلۂ طریقت کے افادہ کو عام کرنے والے صاحب سلسلہ بزرگ بھی تھے۔ راقم اس کو اللہ کے انعامات میں سے اپنے اوپر ایک بڑا انعام سمجھتا ہے کہ اسلام کے ایک عظیم بطل جلیل پر اس کے دوسرے بطل جلیل و عظیم کے قلم سے خراج عقیدت کو جمع کرکے اور ترتیب دے کر پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، جس ذات عالی نے توفیق دی اسی سے قبولیت کی دعا ہے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

محمود حسن حسنی ندوی

جمعۃ المبارک ۷/ جمادی الاخری ۱۴۳۳ھ (دائرہ حضرت شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا حسین احمد فیض آبادیؒ

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ (متوفی ۱۳۴۱ھ-۱۹۲۳ء)
(سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

"حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پر سب سے حقیقت افروز مضمون غالباً وہ ہے جو والد ماجد مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحبؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "نزھة الخواطر" کی آٹھویں جلد میں شامل ہے، مصنف مرحوم نے اپنی زندگی میں ان کا تذکرہ کتاب میں شامل کیا تھا، وہ مولانا کے والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب کے پیر بھائی بھی تھے۔

۱۳۸۸ھ-۱۹۶۸ء میں جب اس آخری حصہ کی اشاعت کا دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے فیصلہ کیا تو راقم سطور نے اس میں معتد بہ اضافہ کیا اور اس کی تکمیل کی، اب وہ کم سے کم عربی میں حضرت مولانا کے سلسلہ میں طاقتور تعارفی مضمون ہے۔" (ابوالحسن علی)

حضرت مولانا سید عبدالحی حسنی نور اللہ مرقدہ کے مضمون کا ترجمہ برادرم مولانا محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاد دار العلوم ندوۃ العلماء) نے کیا ہے، جسے عمومی افادہ اور موضوع کی مناسبت سے یہاں شامل کیا گیا ہے۔ (محمود)

مولانا حسین احمد (مدنی) فیض آبادیؒ ایک بڑے محدث اور علمائے صالحین میں سے تھے۔ ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ میں بانگر مئو میں پیدا ہوئے اور ابتدائی علوم ٹانڈہ میں حاصل کئے۔ ۱۳۰۹ھ میں جب کہ آپ کی عمر صرف تیرہ سال تھی' سفر کر کے دارالعلوم، دیوبند تشریف لے گئے، سات سال تک وہاں رہ کر فراغت حاصل کی۔ ایک لمبے عرصہ تک علامہ محمود حسن دیوبندیؒ کی خدمت میں رہ کر ان سے حدیث و فقہ کا علم حاصل کیا، پھر گنگوہ آگئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوگئے۔ جب آپ کے والد صاحب نے ۱۳۰۶ھ میں مدینہ منورہ ہجرت کی تو آپ بھی مع جمیع خانہ ان کے ہمراہ تھے۔ مکہ مکرمہ میں آپ کی ملاقات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے ہوئی جو کہ آپ کے شیخ الشیخ (پیر کے پیر) تھے، آپ نے ان کی صحبت سے فیض اٹھایا اور خوب استفادہ کیا۔ مدینہ منورہ آکر آپ نے زہد و تقوی، توکل و اخلاص اور سادگی کی زندگی اختیار کی۔ ۱۳۱۸ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے آپ کو بلا لیا، دو سال آپ وہاں رہے، شیخ نے آپ کو اجازت بھی دی۔ ۱۳۲۰ھ میں آپ واپس حجاز تشریف لے آئے، اور حسبۃً للہ مدینہ منورہ میں تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ تہجد کے بعد سے لے کر عشاء کے بعد تک آپ تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے، ۱۳۳۲ھ تک یہی معمول رہا، درمیان میں ہندوستان آمد بھی ہوتی رہی، اور مولانا محمود حسن صاحبؒ کے درس میں شرکت بھی، پھر واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ۱۳۳۳ھ میں آپ کے شیخ مولانا محمود حسن حج کے لیے تشریف لے گئے ۳۴ھ میں وہ مدینہ منورہ پہنچے، آپ ان کے ساتھ ساتھ رہے، اور ان کے ساتھ مکہ مکرمہ آئے، وہ وقت دوسری جنگِ عظیم اور شریف حسین کی عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت کا تھا۔ مولانا محمود حسن کے ساتھ آپ اور آپ کے علاوہ مولوی عزیز گل، حکیم نصرت حسین کوڑا جہان آبادی وغیرہ تھے۔ حجاز کی حکومت نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے انگریز حکومت کے سپرد کر دیا، جس نے ان سب کو پہلے مصر پھر وہاں سے مالٹا منتقل کر دیا۔ ۱۳۳۵ھ

ربیع الآخر کے آخر میں یہ لوگ مالٹا پہنچے اور ۳/سال ۲/مہینے وہیں رہے۔ اسی دوران حکیم نصرت حسین کا انتقال ہو گیا، اور آپ اس عرصہ پوری جانفشانی سے اپنے استاد کی خدمت، اللہ کی عبادت اور کتابوں کے مطالعہ میں لگے رہے اور قرآن کریم بھی حفظ کرلیا۔ ۲۲/جمادی الاخری ۱۳۳۸ھ میں رہائی کا حکم صادر ہوا اور یہ حضرات باعزت بری ہو کر ہندوستان پہنچے، ہندوستان پہنچ کر جب مولانا محمود حسن صاحبؒ مرض وفات میں مبتلا ہو گئے، تو آپ نے راتوں کو جاگ کر ان کی خدمت کی۔ (۱)

اسی دوران مولانا آزاد نے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور مولانا محمود حسن دیوبندی سے فرمائش کی کہ اپنے خواص میں سے کسی کو تدریس کے لئے وہاں بھیج دیں، اس پر انہوں نے ان کو کلکتہ جانے کا حکم دے دیا۔ آپ نے اپنی خواہش پر شیخ کی رضا کو ترجیح دی، اور زیادہ دور نہ گئے ہوں گے کہ شیخ کی وفات کی خبر آ گئی۔ آپ فوراً دیوبند واپس آئے لیکن شیخ کی تدفین ہو چکی تھی۔ اس کے بعد آپ کلکتہ آ گئے اور ایک مدت تک اس مدرسہ میں تدریس میں مشغول رہے۔ پھر وہاں سے (آسام کی راجدھانی) سلہٹ منتقل ہو گئے اور وہاں ۶/سال حدیث شریف کا درس دیتے رہے، لوگوں کی اصلاح کرتے رہے اور ان میں غیرت، حمیت اور آزادی کے جذبہ کی روح پھونکتے رہے، اور بے شمار لوگوں نے وہاں آپ سے فائدہ اٹھایا۔

جب ہندوستان میں آزادی اور سیاسی انقلاب کی تحریک نے زور پکڑا تو آپ بھی اس میں لگ گئے، آپ نے انگریز فوج میں ملازمت کے حرام ہونے کا فتوی دیا، جس کی وجہ سے محرم ۱۳۴۰ھ میں آپ کو قید کر دیا گیا، کراچی کی عدالت میں آپ پر مشہور مقدمہ چلا اور دو سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی اور آخر کار ۴۲ھ میں جا کر

---

(۱) آغاز ترجمہ سے یہاں تک مصنف نزہۃ الخواطر کے قلم سے ہے، پھر فرزند مصنف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اضافہ اور تکمیل ہے، یہ بات مولانا ہارون ندوی اندوری دام ظلہ نے بتائی، جنہوں نے ۶۸-۱۹۶۹ء میں نزہۃ جلد ہشتم کا حضرت مولانا کے ساتھ ٹائپ شدہ پروف پڑھا تھا۔ (محمود)

آپ کو رہائی نصیب ہوئی۔

جب علامہ انور شاہ کشمیری دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کے منصب سے علیحدگی اختیار کر کے ڈابھیل منتقل ہو گئے تو آپ کو شیخ الحدیث اور صدر مدرس چنا گیا، لہذا آپ ۱۳۴۶ھ میں دیوبند منتقل ہو گئے اور حدیث کی تدریس کے ساتھ مدرسہ کی ریاست کی ذمہ داری بھی سنبھال لی، جس سے مدرسہ کی شہرت، مرکزیت اور لوگوں کا اس پر اعتماد محفوظ رہا۔ آپ نے پوری مستعدی کے ساتھ حدیث کا درس دیا، مسلمانوں میں غیرت وحمیت زندہ کی اور بے مثال ہمت اور قوتِ ارادی کے ساتھ درسی وسیاسی دونوں کام انجام دیتے رہے۔ آپ نے ہندوستان کے طول و عرض میں مشقت بھرے سفر کیے، جلسوں میں شرکت کی اور تقریریں کیں، آپ اپنے اوقات کے بڑے پابند تھے، راتوں کو جاگ کر اپنے اوراد و وظائف پورے کرتے اور درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور پھر پوری بشاشت کے ساتھ درس دیتے۔ آپ کے اندر حد سے زیادہ تواضع تھی، آپ آنے والے وفود اور ملاقاتیوں کا اکرام کرتے اور سائلوں کا حق ادا کرتے۔

آپ نے قومی مسئلہ کی طرف بھی توجہ کی، نہ صرف اس کی تائید کی بلکہ جمعیت علماء کا پورا ساتھ دیا' جس کے آپ اہم ترین رکن بھی تھے، اور ۱۳۵۱ھ میں تحریک کی قیادت کی، جس کی وجہ سے آپ گرفتار کر لیے گئے لیکن پھر چھ مہینے کے بعد چھوڑ دیا گیا، جمعیت کے کئی سالانہ جلسوں کی آپ نے صدارت بھی کی، ۱۳۶۱ھ میں جب قومی تحریک کھڑی ہوئی اور اس کا ماحول گرم ہوا اور کانگرس نے انگریزوں سے ملک چھوڑنے کو کہا تو آپ نے اس موقعہ پر ایک جوشیلی تقریر کی، جس کی وجہ سے ۲۲/ جمادی الاخری ۱۳۶۱ھ میں آپ کو گرفتار کر لیا گیا، تین سال تک آپ نے صبر و احتساب کے ساتھ قید میں گزارے او زیتیں برداشت کیں، عبادت کرتے رہے اور دیگر قیدیوں کو فائدہ پہنچاتے رہے، تا آنکہ ۶/ رمضان ۱۳۶۳ھ میں آپ کا رہائی

نامہ جاری ہوا اور آپ نے قید خانہ سے واپس آکر پھر وہی جنگ و جہاد، تعلیم و تدریس، اصلاح وارشاد اور ملک وقوم کی خدمت کا سلسلہ شروع کردیا۔

اسی دوران اسلامی جماعت کی تحریک نے زور پکڑا اور ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ اور پاکستان کے نعرے لگانے شروع کیے، اور عام مسلمان جوش وجذبہ میں آکر اس تحریک سے قریب ہوتے چلے گئے، لیکن آپ دیکھ رہے تھے کہ اس سوچ سے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچے گا، آپ کا خیال تھا کہ اس سے مسلمان اپنا سیاسی مرکز اور ملی اتحاد کو کھودیں گے، لہٰذا آپ نے پورے اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ اس تحریک کی مخالفت کی، ملک بھر میں دورے کیے اور برملا اپنی سوچ کا اظہار کیا اور کسی کے لعن طعن کی اور نہ اپنی عزت وآبرو کی پرواہ کی۔ اس کے نتیجہ میں جوش سے بھرے ہوئے تقسیم کا مطالبہ کرنے والوں اور اسلامی جماعت کے پیروکاروں کے غصہ کا آپ کو سامنا کرنا پڑا، لیکن آپ نے صبر واحتساب کے ساتھ ان کی جانب سے ملنے والی تکلیفوں اور رسوائیوں کا تحمل کیا، اور اپنی کوشش میں کمی نہیں آنے دی اور نہ ہی اپنی سرگرمیوں کو روکا، اور بے حرص وطمع، کسی تعریف وتنقیص کی پرواہ کیے بغیر برابر مسلم برادران وطن کو صحیح بات سمجھاتے رہے۔ آخرکار رمضان ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں تقسیم کا اعلان ہوگیا اور فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، ملک کے شہروں اور قریوں میں قتل عام شروع ہوگیا، خاص طور پر شمال مغربی ہندوستان اور دہلی کے اطراف میں مسلمان اس کا شکار ہوئے، اور وہی ہوا جس کا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اندیشہ تھا، جو لوگ پاکستان جاسکے وہ پاکستان چلے گئے اور جو ہندوستان میں رہ گئے ان کو بڑی پریشانی اور زبوں حالی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے بعد اس بات کا خطرہ تھا کہ دینی و تعلیمی مراکز کو زوال نہ آجائے اور ہندوستان کے بچے کھچے مسلمان کہیں اکثریت کے سامنے ڈھیر نہ ہوجائیں، اس موقعہ پر آپ نے ایک دین کے واعظ کا رخ اختیار کیا، مسلمانوں میں ایمان، توکل علی اللہ اور دینی حمیت کی روح پھونکی، اور ان کو دعوت

دی کہ وہ حملہ آوروں کا مقابلہ، اللہ کے بھروسہ پر صبر و ثابت قدمی کے ساتھ کریں۔ آپ کی نصیحتوں اور کوششوں سے اجڑے ہوئے دل قوت پا گئے، لڑکھڑاتے قدم جمنے لگے، خطرہ ٹل گیا، گھٹا چھٹ گئی اور مسلمانوں کے دینی و تعلیمی ادارے کسی قسم کے زوال کا شکار نہ ہو سکے، اور مسلمانوں نے پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اپنی زندگی کا کاروبار شروع کر دیا۔

تقسیم ہند کے بعد آپ نے عملی طور پر سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی، اور درس و تدریس، دعوت و ارشاد اور تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے، حکومت اور حکومت کے لوگوں سے آپ کا تعلق باقی نہیں رہا، جمادی الاولی ۳۷۳ھ (۱۹۵۴ء) میں صدر جمہوریہ ہند نے آپ کو ایک اعزازی عہدہ دینے کی پیش کش بھی کی لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا یہ ہمارے اسلاف کے طرز عمل سے میل نہیں کھاتا۔ آپ دار العلوم دیوبند ہی میں حدیث شریف کا درس دیتے رہے، اور ساتھ میں ملک کے دورے بھی کرتے رہے، اور مسلمانوں کو دعوت دیتے رہے کہ دین کو مضبوطی سے تھامے رہیں، شریعت اسلامی کے احکام کی پیروی کرتے رہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر چلتے رہیں، اور اللہ کے ذکر کی کثرت اور اصلاحِ حال کرتے رہیں۔ اللہ تعالی نے لوگوں کے دلوں کو آپ کی طرف مائل کر دیا تھا اور آپ کی محبت ان کے دلوں میں راسخ کر دی تھی، ہر طرف سے لوگ آپ کی خدمت میں تنہا بھی اور گروہوں کی شکل میں بھی حاضر ہوتے تھے اور اسی طرح اپنے یہاں بلانے والوں کے دعوت ناموں کا بھی آپ کے پاس ڈھیر لگا رہتا تھا، جن کو آپ بڑی خوش دلی سے قبول کر لیتے تھے اور مشقتیں اٹھا کر وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ آخر کار آپ مرضِ قلب اور بلڈ پریشر میں مبتلا ہو گئے، جس کی وجہ سے کچھ مدت تک سفروں کا سلسلہ منقطع رہا، اور آپ کو مستقل گھر پر رہنا پڑا، اس حال میں بھی آپ اپنے معمولات کی پابندی، اصلاح و تربیت کی کوشش، آنے والوں سے ملاقات اور مہمانوں کا اکرام کرتے رہے۔ آخر میں آپ پر اللہ تعالی کی خشیت اور

رقت قلب کا غلبہ ہونے لگا اور اپنے رب کے حضور گریہ وزاری اور اس سے ملاقات کی تیاری میں لگ گئے۔ ۱۳؍جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے ایک جمِ غفیر کو نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے شیخ مولانا محمود حسن دیوبندی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے جوار میں مدفون ہوئے۔

مولانا حسین احمد کی شخصیت صدق واخلاص، خودداری، قوتِ ارادی اور بلند ہمتی میں یکتائے روزگار شخصیت تھی، آپ تکلیفوں پر صبر کر لیتے تھے اور دشمنوں کو نہ صرف معاف کر دیتے تھے بلکہ ان کی سفارشیں کرتے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوششیں کرتے تھے، آپ اپنے اصولوں کے پابند، کشادہ ذہن اور مختلف خصوصیات کے حامل تھے۔ آپ نے متضاد میدانوں میں کام کیے، اس کے باوجود آپ کی پاکیزگی پر شبہ نہیں کیا جاسکا، آپ کی بلند ہمتی سستی و کمزوری سے آشنا نہ ہوسکی اور آپ کی زندگی عملِ پیہم سے عبارت رہی۔

آپ کے اوقات مصروفِ کار اور منظم رہتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد مہمانوں کے ساتھ جن کی بڑی تعداد ہوتی تھی' ناشتہ کرتے، پھر دار الحدیث چلے جاتے، صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا درس دیتے، عام طور پر عبارت خود عربی لہجہ میں اور صاف و بلند آواز میں پڑھا کرتے اور پھر اس کی خوب توضیح وتشریح فرماتے۔ اس کے بعد واپس آتے اور مہمانوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا تناول فرماتے پھر قیلولہ کرتے۔ ظہر کی نماز کے بعد آنے والوں سے ملاقات کی نشست ہوتی، ان کے ساتھ چائے پی جاتی، خط وکتابت کا سلسلہ چلتا، اور سائلوں اور ضرورت مندوں کی حاجات روائی کی جاتی۔ عصر کے بعد بھی ملنے والوں کے ساتھ نشست ہوتی اور آپ بڑی انسیت کے ساتھ ان سے گفتگو فرماتے۔ تعلیمی سال کا جب آخر ہوتا تو اس وقت بھی مغرب تک درس دیتے۔ مغرب کی نماز کے بعد نفلوں کے لئے کھڑے ہوجاتے جن میں قراءت وقیام

خوب لمبا ہوتا، اس کے بعد مریدوں اور اہلِ سلوک کے لئے وقت نکالتے۔ عشاء کے بعد صحیح بخاری کا درس ہوتا جو تہائی رات یا نصف شب تک جاری رہتا، پھر گھر تشریف لے جاتے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد تہجد کے لئے کھڑے ہوجاتے اور خوب لمبا قیام کرتے۔ تہجد کے بعد ذکر و مراقبہ ہوتا، خوب رو رو کر دعائیں مانگتے اور کبھی منظوم مناجات کے رقت بھرے اشعار گنگناتے اور اسی حال میں صبح ہوجاتی تو فجر کی نماز پڑھتے۔ سفر و حضر میں سنن رواتب کا اور فرض میں مسنون سورتوں کا اہتمام رہتا اور اس میں کبھی خلل نہ پڑتا۔ عمر کے آخری حصہ میں دین کی حمیت اور شریعت و سنت کی غیرت کا آپ پر بڑا غلبہ رہتا تھا، اور ذرا سی کوتاہی اس میں برداشت نہ ہوتی تھی، کبھی تو غصہ آجاتا تھا اور اس شخص پر چلا پڑتے تھے جس سے سنت نبوی کی خلاف ورزی یا شعائرِ اسلام کی بے وقعتی ہوئی ہو۔

اپنے اساتذہ و مشائخ سے آپ کو بڑی محبت تھی اور ان کے تئیں بڑی غیرت رکھتے تھے۔

آپ میانہ قد اور لحیم و شحیم تھے، سر بڑا، پیشانی کشادہ، بڑی بڑی آنکھیں، گندمی رنگ، کسرتی بدن اور مضبوط جسم والے تھے۔ بڑا باوقار و بارعب چہرہ تھا جس پر ترش روئی نہ ہوتی تھی، بلکہ ہمیشہ کھلا ہوا رہتا تھا، دیسی کھدر کا لباس پہنتے تھے، اپنے استاد مولانا محمود حسن کی طرح انگریزوں سے شدید نفرت رکھتے تھے اور آپ کی محبت و نفرت خالص اللہ کے لئے ہوتی تھی۔ سونے اور جاگنے کے معاملہ میں بڑے مشاق تھے، جب چاہے سو جاتے اور جب چاہتے جاگ جاتے، رمضان میں عبادت و ریاضت اور بڑھ جاتی تھی، سینکڑوں مریدین آجاتے، آپ کے ساتھ روزے گذارتے اور قیام اللیل کرتے، جس جگہ آپ کا رمضان ہوتا وہ جگہ ذکر و تلاوت، شب بیداری اور عبادت گذاری سے آباد ایک خانقاہ میں تبدیل ہوجاتی۔

آپ کی تصنیفات بہت کم ہیں۔ آپ کی ایک تصنیف ''الشہاب الثاقب'' ہے،

ایک سفرنامہ مالٹا ہے، جس میں مالٹا کے ایام قید بندی کا ذکر اور اپنے شیخ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے حالات ہیں۔ اسی طرح ایک تصنیف دو جلدوں میں "نقشِ حیات" کے نام سے ہے جس کا اکثر حصہ سیاسی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ (مولانا نجم الدین اصلاحی) نے تین جلدوں میں آپ کے خطوط بھی جمع کیے ہیں۔(۱)

---

(۱)الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام المجلد الثالث، الجزء الثامن،ط:دار ابن حزم بیروت (محمود)

باب اول

شخصیت کے تشکیلی عناصر اور علمی وروحانی سلسلے

ولی اللہی درسگاہ سے انتساب اور اجازت حدیث

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو اپنے بھائیوں میں وہ مقام حاصل ہوا جو حضرت مجددؒ کے صاحبزادوں میں حضرت خواجہ محمد معصوم کو حاصل ہوا تھا، اور ان کے ذریعہ حضرت شاہ صاحبؒ (امام احمد بن عبدالرحیم ولی اللہ دہلویؒ) کے سلسلہ اور آپ کے علوم وتعلیمات کی عالمگیر اشاعت ہوئی۔ (۱)

جہاں تک درس حدیث اور اس کی ترویج واشاعت کا تعلق ہے، ہندوستان کی علمی ودینی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، آپ (حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی جانشین حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) (۲) کے درس حدیث کی مدت

(۱) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ: ۳۴۶ (۲) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان دونوں بزرگوں کی خدمت حدیث کو ان کے تجدیدی کارناموں میں شمار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ہندوستان کے تحتی براعظم بلکہ حقیقتاً دور اخیر میں (جو بارہویں صدی ہجری کے وسط سے شروع ہوکر اس وقت تک قائم ہے) شاہ صاحب (یعنی حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نے حدیث کی ترویج واشاعت، درس حدیث کے احیاء، فن حدیث کے ساتھ اعتناء اور اس موضوع پر اپنی محققانہ ومبصرانہ تصنیفات کے ذریعہ ایسا عظیم تجدیدی کارنامہ انجام دیا...... (باقی اگلے صفحہ پر

تقریباً چونسٹھ سال کی ہے، آپ نے حدیث کے ایسے اساتذہ کاملین اور تلامذہ راشدین پیدا کیے جنہوں نے ہندوستان میں نہیں حجاز میں بھی درس حدیث کا فیض عام کیا، اور ایک عالم کو مستفید کیا۔ (۱)

ان تلامذۂ حدیث اور تربیت یافتہ شیوخ میں حدیث کی سب سے بڑی اشاعت حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے ذریعہ ہوئی، جنہوں نے ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ ہجرت کی اور ان سے حجاز کے ممتاز ترین علماء نے حدیث کی سند لی۔ (۲)

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے تلامذہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی (۱۲۹۶ھ) بھی شامل ہیں، جن سے ہندوستان کے کبار علماء و اساتذہ حدیث کو شرف تلمذ حاصل ہے، اور ان کے ذریعہ سارا ہندوستان حدیث کے نور سے منور اور معمور ہوگیا، اور اس وقت کے سارے حلقہائے درس اور مدارس عربیہ انہیں سے شرف انتساب رکھتے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، (بانی دار العلوم دیوبند) ان کے نامور تلامذہ میں سے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تلامذہ کبار میں مولانا محمد یحیی کاندھلوی، اور حضرت مولانا خلیل احمد

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)......جو ان کے صحیفہ تجدید اور کتاب زندگی کا ایک اہم اور روشن باب ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد پنجم، ص:۱۶۹) اور ان کے جانشین وفرزند اکبر سراج الہند ومسند الہند مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاہ صاحب کے خصوصی کاموں کی توسیع وتکمیل میں حدیث کی نشر واشاعت اس کے درس واجازت کے سلسلہ کا احیاء، اس کے حلقہائے درس کا اجراء، اساتذۂ حدیث، اشاعت وتبلیغ قرآن کے بعد جگہ دی ہے، اور پھر اس کے عہد بہ عہد اثرات اور درس حدیث کے امتداد کو بیان کرتے ہوئے اس سلسلۂ زریں کو محدث العصر علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور تک پہنچایا ہے، جن کے تلامذہ کے ذریعہ یہ فیضان عالم گیر ہو چکا ہے، اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئیں، علم حدیث کی درسگاہیں ان عظیم اساتذہ حدیث کے توسط ولی اللّٰہی درسگاہ سے انتساب رکھتی ہیں۔ (محمود)

(۱) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ:۳۵۸ (۲) ایضاً:۳۵۹

صاحب سہارنپوری کے تلامذہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی مصنف اوجز المسالک وغیرہ کا نام لینا کافی ہے، مولانا محمد قاسم صاحب کے تلامذہ میں مولانا احمد حسن صاحب امروہی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے تلامذہ میں مولانا سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں، شاہ صاحب کے علو اسناد، عموم فیض اور بلندی مرتبہ کے لیے ان کے شاگرد رشید مولانا محسن بن یحیٰ ترہتی کی مشہور کتاب "الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبد الغنی" کا مطالعہ معلومات افزا و بصیرت افروز ہے۔ (۱)

دارالعلوم دیوبند

جہاں تک علماء کا تعلق ہے ان کو رسوخ فی الدین، زہد و تقویٰ، ایثار و اخلاص، دینی غیرت و حمیت اور اس کی راہ میں قربانی کے میدان میں عالم اسلام کی سب سے طاقتور دینی شخصیت اور عنصر قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اس علم و بربریت اور غیر معمولی سنگ دلی اور بے رحمی کی وجہ سے جس کا مظاہرہ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے معاملہ میں کیا تھا جن کو وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کا اولین رہنما اور حقیقی قائد تسلیم کرتی تھی نیز عیسائیت کی ترویج و اشاعت میں حکومت کی سرگرم جوشی اور مغربی تہذیب کی عوام میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اس کے اثرات کی وجہ سے ان لوگوں کے اقدام کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، انہوں نے اس کی فکر شروع کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے، اور اسلامی تہذیب اور ثقافت کے لیے قلعہ بندیاں کر لی جائیں، اور پھر ان قلعوں میں (جن کو عربی مدارس کے نام سے پکارا گیا

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ پنجم، ص: ۳۶۱ (الیانع الجنی ڈاکٹر ولی الدین ندوی کی تحقیق کے ساتھ منظر عام پر آچکی ہے۔ (م)

ہے) مبلغ اور داعی تیار کیے جائیں، اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے (جس کا آغاز ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا) سربراہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دار العلوم دیوبند) تھے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے تذکرہ ''سوانح قاسمی'' میں لکھتے ہیں:

> ''۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا، دار العلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اسی لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی و جوہری عنصر تھا۔ شاملی (۱) میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا چھوڑ دیا، اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تھے، بلکہ ''بقاء اسلام اور تحفظ علم دین'' کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لیے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و نظر تھے، اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگائے غیبی لطیفہ کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے''۔ (۲)

مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی (شیخ الہندؒ) نے ایک موقع پر مصنف ''سوانح قاسمی'' ہی سے سوال کرتے ہوئے فرمایا:

> ''حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک

---

(۱) شاملی ضلع مظفر نگر دہلی اور سہارنپور کی چھوٹی لائن پر واقع اور ایک آباد قصبہ اور غلہ کی بڑی منڈی ہے، یہاں ۱۸۵۷ء میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور ان کے رفقاء نے انگریزوں سے جنگ کی تھی، اور حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے۔

(۲) سوانح قاسمی، حصہ دوم، ص: ۲۲۳-۲۲۴

میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"۔ (۱)

اس تحریک اور اس کے قائدین نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دین کی محبت، شریعت کا احترام اور اس کے راستہ میں قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلہ میں زبردست استقامت وصلابت (جو کسی اور ایسے اسلامی ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کو مغربی تہذیب اور مغرب کے اقتدار سے واسطہ پڑا ہو) پیدا کردی، دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان میں قدیم اسلامی ثقافت وتہذیب وتربیت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ (۲)

دار العلوم کو روز اول ہی سے مخلص کارکن اور صاحب دل اساتذہ کا تعاون حاصل رہا ہے جس کی وجہ سے تقویٰ وطہارت، اخلاص، تواضع اور خاکساری کی روح پورے ماحول پر طاری رہی، ان باکمال ومخلص اساتذہ میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا غلام رسول ولایتی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، اور مولانا اعزاز علی صاحب کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا، دار العلوم کا دائرۂ عمل روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا، اس کی شہرت اور اساتذہ دار العلوم کے تبحر علمی، صلاح وتقوی اور فن حدیث وفقہ میں ان کی مہارت خصوصی کے چرچے دور دور پھیل گئے، جس کو سن کر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اور دوسرے اسلامی ممالک سے کثیر تعداد میں طلباء حصول علم دین کے لیے وہاں آئے۔ (۳)

ہندوستانی مسلمانوں کی دینی زندگی پر دار العلوم دیوبند کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کے نمایاں اثرات رونما ہوئے، بدعات ورسوم کی اصلاح، عقائد کی درستی،

---

(۱) سوانح قاسمی، حصہ دوم، ص:۲۲۶ (۲) اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش:۹۰

(۳) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، ص:۱۰۶

تبلیغ دین اور فرق ضالہ سے مناظرہ وغیرہ میں ان حضرات کی جد و جہد لائق تحسین ہے، متعدد فضلاء نے سیاسی میدان اور وطن عزیز کے دفاع کے سلسلہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور حق گوئی و بے باکی میں علمائے سلف کی یاد تازہ کردی۔ (۱)

دار العلوم دیوبند کا پیغام اور امتیاز

اس درس گاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید وسنت پر اپنی توجہ مرکوز کی اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اس کو عزیز ہے۔

دوسری خصوصیت اتباع سنت کا جذبہ اور فکر ہے، تیسری خصوصیت تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر و حضوری اور ایمان و احتساب کا جذبہ ہے۔ چوتھا عنصر اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش اور دینی حمیت و غیرت ہے۔

یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبندی بنتا ہے اگر ان میں سے کوئی عنصر کم ہو جائے تو دیوبندیت ناقص ہے، فضلائے دار العلوم دیوبند کا یہی شعار رہا ہے، اور وہ ان چار چیزوں کے جامع رہے ہیں۔ (۲)

سلسلہ قادریہ راشدیہ اور اس میں اجازت وخلافت

بارہویں صدی (ہجری) کے تقریباً وسط میں سندھ و بلوچستان میں ایک مشہور شیخ طریقت سید محمد راشد گذرے ہیں، جن کا سلسلہ قادریہ تھا، میں نے مولانا عبید اللہ سندھی سے خود سنا ہے کہ وہ ان دیار میں علمی اور روحانی طور پر تقریباً وہی مرتبہ اور شہرت رکھتے ہیں، جو ان کے معاصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کا شمال مغربی ہندوستان میں تھا، سید محمد راشد اپنے والد سید محمد بقا کے مرید و مجاز تھے، وہ سید عبد القادر جیلانی خامس کے خلیفہ تھے، جو پیر کوٹ سید ھانہ (ضلع جھنگ سیال پنجاب) میں

(۱) ایضاً: ص: ۱۳۲-۱۳۳ (۲) کاروان زندگی، حصہ دوم، ص: ۲۱۱

مدفون ہیں، یہ سلسلہ بعد میں بغداد و حلب سے اُچ (ریاست بھاول پور) پہنچا، جہاں اس سلسلہ کے نو مشائخ مدفون ہیں۔

سید محمد راشد کے تین نامور اور ممتاز خلفاء تھے، دو خود ان کے صاحبزادے سید صبغۃ اللہ اور سید محمد یاسین، سید صبغۃ اللہ اور سید محمد لیس کے درمیان والد نامدار کے تبرکات اور مناصب کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ سید صبغۃ اللہ کے سر پر دستار خلافت و مشیخت باندھی گئی، اسی وجہ سے وہ سندھیوں میں پیر پگاڑو کے شہرہ آفاق لقب سے مشہور ہوئے، یہی پیر صبغۃ اللہ ہیں، جنہوں نے حضرت سید احمد شہید اور ان کے قافلہ کی ۱۲۴۱ھ - ۱۸۲۶ء کے سفر ہجرت میں بڑی اولوالعزمی کے ساتھ ضیافت و میزبانی کی، اور انہی کی وجہ سے ان کے مستقر پیر کوٹ میں آپ کا تیرہ روز قیام رہا، سید صاحب کے اہل و عیال عمر کوٹ سے آکر ۶-۷ سال وہیں مقیم رہے اور پھر آپ کی شہادت کے بعد وہیں سے مستقل طور پر ٹونک منتقل ہو گئے۔

سید محمد یاسین کے حصہ میں علم (جھنڈا) آیا، وہ پیر جھنڈا کے لقب سے مشہور ہوئے، پیر جھنڈا کا کتب خانہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں مشہور و معروف ہے، ۱۹۴۴ء کے اوائل میں راقم سطور نے مولانا عبید اللہ صاحب کی ملاقات کے لیے جو اس وقت ٹھٹھ پیر جھنڈا میں مقیم تھے، وہاں حاضری دی، اس وقت اس سلسلہ کے شیخ پیر ضیاء الدین زندہ تھے، اور انہوں نے میزبانی فرمائی۔

سید محمد راشد کے تیسرے خلیفہ حضرت شاہ حسن تھے، جن سے سندھ، ریاست بہاول پور اور پنجاب میں سلسلہ کی بڑی اشاعت اور عقائد و اعمال کی بڑی اصلاح ہوئی، انہیں کے سلسلہ میں حافظ محمد صدیق صاحب بھر چونڈی والے ہوئے، جن کے دو ممتاز ترین خلفاء مولانا سید تاج محمود امروٹی اور حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری تھے، مولانا سید تاج محمود امروٹی پر جلال اور جذبہ جہاد غالب تھا، کرامات جلیہ کا ان سے ظہور ہوا، کئی بار انگریزوں کو چیلنج کیا، اور ان کے مقابلہ میں آگئے، حکومت نے شورش عام کے خطرہ سے طرح دی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے بڑا اخلاص و اختصاص تھا، ایک

مرتبہ ان کی خدمت میں بڑے اہتمام سے ایک ٹوپی بھیجی، اس پر لکھا "تاج محمود"۔

حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب پر جمال کا غلبہ تھا، بڑے صاحب سکینت اور تمکین تھے، چہرۂ مبارک گلاب کی طرح سرخ اور آفتاب کی طرح پرانوار معلوم ہوتا تھا، نہایت صاحب وجاہت اور صاحب جمال تھے، عرصہ تک دستور رہا کہ بہاول پور کا کوئی نواب گدی پر بیٹھتا تو حضرت ہی اس کی دستار بندی گویا تاج پوشی فرماتے، تقریباً ناخواندہ تھے، میں نے جب ۱۹۳۱ء میں زیارت کی تو اس وقت کسی استاد کے سامنے قرآن شریف کی تصحیح فرمارہے تھے،(۱) پنجاب وسندھ کے تمام مشائخ ان کے علوئے مرتبہ،

---

(۱) صاحب تحریر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے خانقاہ دین پور اپنی حاضری اور حضرت دین پوری کے حال وقال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کے جون کی کوئی تاریخ تھی کہ میں کراچی میل سے خان پور کے لیے روانہ ہوا، ایک رفیق درس اور دوست مولوی محمد موسی سندھی رفیق سفر تھے، جو خود بڑے صاحب صلاح اور قوی الاستعداد نوجوان تھے، مغرب کو ہم لوگ خان پور پہنچے، وہاں سے دین پور کی طرف روانہ ہوئے، غالباً رات ہی کو حضرت کی زیارت ہوگئی، ایسا منور چہرہ غالباً اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا، نہایت کم گو، اور کم سخن بزرگ تھے، گفتگو بھی فرماتے تو ٹھیٹ ریاستی زبان میں، جو ملتانی وسندھی کا مجموعہ ہے، اور جس سے میں بالکل ناآشنا تھا، دین پور کی دنیا ہی نرالی تھی، وہ صحیح معنی میں دین پور تھا، قادری طریقہ پر ذکر جہر سے مسجد وخانقاہ اور بستی ہر وقت گونجتی رہتی تھی، اگر کوئی کسی کو آواز بھی دیتا تو پکارنے والا بھی "لا الہ الا اللہ" کہتا اور جواب دینے والا بھی "لا الہ الا اللہ" ہی سے اس کا جواب دیتا، اس طرح وہاں ذکر جہر، اور اللہ اللہ کے سوا کوئی اور بلند آواز سننے میں نہ آتی، یہ ایک چھوٹا گاؤں تھا، جس میں صرف حضرت اور حضرت کے متعلقین آباد تھے، نیم خام، نیم پختہ چند مکانات جن کی تعداد شاید ۵-۷ سے زیادہ نہ ہو، ایک سادہ سی مسجد، چند خام حجرے ذاکرین کے لیے، کچھ کھجوروں کے درخت جن کو دیکھ کر عرب کی بادیہ کی بستیاں یاد آتی ہیں، آب وہوا بھی بادیہ عرب سے ملتی جلتی تھی، مقیمین خانقاہ کے لیے ایک لنگر تھا، جس میں خالص سندھی اور بھاولپوری مذاق کا ایسا کھانا تیار ہوتا جو قوت لایموت کا صحیح مصداق تھا، اور ہم اودھ کے نازک مزاج مہمانوں کے لیے اس کا کھانا بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا، گرمی شدت کی تھی، دن بھر لو چلتی، رات کسی قدر ٹھنڈی ہوتی۔ یہ تھا دین پور کا نقشہ جہاں عمر میں صرف دو مرتبہ جانا ہوا، ایک اسی ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں دوسرے ۱۹۵۸ء یا اس کے بعد خلیفہ صاحب کی وفات کے ایک عرصہ کے بعد ایک شب کے لیے جانا ہوا..... (باقی اگلے صفحہ پر)

قوت نسبت اور ان کی بزرگی کے قائل تھے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے خود سے مجھ سے فرمایا کہ ان کو بھی حضرت خلیفہ صاحب سے اجازت حاصل ہے۔ (۱)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ)...... حضرت خلیفہ صاحب کی عمر اس وقت (یعنی ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں) بھی نوے سال سے متجاوز تھی، مولانا احمد علی صاحب (لاہوریؒ) کا خط آپ کو سنایا گیا جس میں غالباً حضرت سید صاحب (حضرت سید احمد شہیدؒ) کی نسبت سے میرا تعارف تھا، حضرت نے سلسلہ میں داخل فرمایا، اور ذکر قلبی کی تلقین کی، جس وقت رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ "ان کو سلام کہہ دینا" میں نہیں سمجھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے، صاحبزادہ میاں عبدالہادی صاحب پاس سے گذر رہے تھے، انہوں نے تشریح فرمائی کہ مولانا اشرف علی تھانوی کو، مولانا کا نام سنتے ہی خلیفہ صاحب پر رقت طاری ہوگئی، اس سے اس تعلق کا اندازہ ہوتا ہے جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان تھا، مجھے معلوم ہوا کہ مولانا تھانوی ایک مرتبہ کراچی سے آتے ہوئے خلیفہ صاحب کی زیارت اور ملاقات کے لیے دین پور ٹھہرے تھے" (پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ۱۲۹-۱۳۰)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بذریعہ مکتوب حضرت خلیفہ صاحب قدس سرہ کا سلام عرض کیا، جس کے جواب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے اپنا تاثر یہ تحریر کیا: "حضرت خلیفہ صاحب کے پیام وسلام سے ان کی یاد تازہ ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کے برکات میں تضاعف فرماوے، باقی آپ کے لیے دعا کرتا ہوں اور دعا چاہتا ہوں، جس کا صیغہ مدت دراز سے یہ تجویز کر رکھا ہے: اللّٰھم کن لنا واجعلنا لك، والسلام) (پرانے چراغ، ۱/: ۱۰۶) (محمود)

(۱) پرانے چراغ، حصہ اول، طبع جدید، ص: ۱۲۷-۱۲۹

"سلسلۂ قادریہ راشدیہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو حضرت خلیفہ غلام محمد دینپوریؒ سے، ان کو حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈویؒ سے، ان کو حضرت شاہ حسنؒ سے، ان کو حضرت سید محمد راشدؒ سے، ان کو حضرت سید محمد بقاءؒ سے، ان کو حضرت سید عبدالقادر جیلانی خامسؒ سے، ان کو حضرت سید محمد صالحؒ سے، ان کو حضرت سید شمس الدین ثانیؒ سے، ان کو حضرت سید حامد گنج بخش ثانیؒ سے، ان کو حضرت سید عبدالقادر رابعؒ سے، ان کو حضرت سید عبدالقادر ثالثؒ سے، ان کو حضرت سید حامد گنج بخش کلاںؒ سے، ان کو حضرت سید عبدالرزاقؒ سے، ان کو حضرت سید عبدالقادر ثانی اچیؒ سے، ان کو حضرت سید محمد غوث گیلانی حسنی حلبی اچیؒ سے، ان کو حضرت سید شمس الدین گیلانی حلبیؒ سے، ان کو حضرت سید شاہ میرؒ سے، ان کو حضرت سید علیؒ سے، ان کو حضرت سید مسعود حلبیؒ سے، ان کو حضرت سید ابوالعباس احمدؒ سے، ان کو حضرت سید صفی الدین صوفیؒ سے، ان کو شیخ العارفین حضرت سید سیف الدین عبدالوہابؒ سے اور ان کو اپنے والد شیخ المشائخ پیران پیر، شیخ شیوخ الطریقہ والشریعہ حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانی بغدادیؒ سے اجازت وخلافت حاصل ہے۔" (محمود)

سلسلۂ چشتیہ اور اس سے انتساب

جس طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس وبانی ہیں، خواجہ فرید الدین اس کے مجدد اور اس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں، آپ ہی کے دو خلفاء سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی (اولیاء) اور حضرت شیخ علاء الدین علی صابر پیران کلیر کے ذریعہ یہ سلسلہ ہندوستان میں پھیلا اور ان کے خلفاء واہل سلسلہ کے ذریعہ اب بھی زندہ وقائم ہے، سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدینؒ پہلے چشتی شیخ ہیں، جن کے اثرات ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیلے اور جنہوں نے ہندوستان کے اسلامی معاشرہ اور ہر طبقہ کو متاثر کیا، اور حکومت سے لے کر عوام وغربا تک کو اپنے حلقۂ عقیدت واثر میں لیا، اسی کے ساتھ وہ ہندوستان کے پہلے شیخ طریقت اور مرشد روحانی ہیں، جن کے حالات سب سے زیادہ تفصیل ووضاحت اور استناد کے ساتھ ملتے ہیں، ان کے مشائخ نے نہ کوئی تصنیف کی، نہ ان کے خلفاء نے اپنے شیوخ کے ملفوظات وحالات جمع کئے، نہ انہوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات وحالات کا کوئی مجموعہ تیار کیا، لیکن ان کے ملفوظات وحالات جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا۔

شیخ کبیر علاء الدین علی بن احمد صابر نسباً اسرائیلی تھے، ترک وتجرید اور زہد ومجاہدہ میں ان کی نظیر نہ تھی، پیران کلیر میں عرصہ تک عبادت وافادہ میں مشغول رہ کر ۱۳/ ربیع الاول ۶۸۹ھ یا ۶۹۰ھ میں وفات پائی، حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ ہی کے خلیفہ ہیں، عجیب بات ہے کہ شیخ علی احمد صابر کے حالات سے معاصر تذکرے اور تاریخیں خاموش ہیں، سیر الاولیاء میں امیر خورد نے ان کا تذکرہ ضمناً اس طرح کیا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو شبہ ہے کہ یہ حضرت شیخ علی احمد صابر پیران کلیری کا تذکرہ ہے یا اسی نام کے کسی اور بزرگ کا، امیر خورد لکھتے ہیں:

> ”بندہ نے اپنے والد رحمہ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ ایک عالی مرتبہ درویش تھے، جن کو شیخ علی صابر کہتے تھے، درویشی میں راسخ

اور صاحب نسبت و تاثیر قصبہ دیگری کے رہنے والے تھے،
حضرت شیخ فرید الدین سے نسبت ارادت رکھتے تھے اور آپ
نے ان کو اجازت بیعت دے رکھی تھی"۔(۱)

معاصر یا زمانہ قریب کے تذکروں میں خواہ ان کا تذکرہ بالکل نہ ہو یا سرسری و مختصر ہو ان کے سلسلہ کے مشائخ کبار کے حالات ان کا علو شان، ان کے علوم و مقامات، اہل بصیرت کا اس سلسلہ کی مقبولیت پر اتفاق اور عالم میں اس کے فیوض و برکات و آثار شاہد ہیں کہ بانی سلسلہ نہایت عالی مقام، عالی نسبت اور عند اللہ مقبول تھے، اس سے بڑھ کر خود تاریخ کی شہادت بھی نہیں ہوسکتی، اور نہ تاریخ کی یہ پہلی غفلت اور چوک ہے، زمانہ سابق میں بھی بہت سی باکمال شخصیتیں تاریخ کی تیز نگاہوں سے بچ گئیں اور زاویہ خمول میں رہ گئیں۔

اس سلسلہ (صابریہ چشتیہ) میں بڑے نامور مشائخ، عارف و محقق و مصلح پیدا ہوئے، مثلاً: حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی جن کی ذات بابرکات کو بعض اہل نظر نے نویں صدی کا مجدد بھی شمار کیا ہے، حضرت (شیخ المشائخ) شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانی دار العلوم دیوبند) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندہلویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی۔

ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ سے حفاظت و تجدید دین کا عالمگیر کام لیا، اور اس وقت سب سے زیادہ وسیع، متحرک و فعال یہی سلسلہ ہے، دار العلوم دیوبند و مظاہر العلوم کی تعلیمی خدمت، در مولانا تھانویؒ کی تصنیفات و مواعظ سے اور پھر

(۱) سیر الاولیاء صفحہ: ۱۸۵

آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ سے اس سلسلہ کے فیوض عالمگیر ہوئے، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تاریخ مشائخ چشت میں صحیح لکھا ہے کہ

"گذشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس نے کیا تھا"۔ (۱)

آج بھی رائے پور میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی خانقاہ سلسلۂ چشتیہ کی قدیم خانقاہوں کی یکسوئی، سرگرمی یاد حق کی مشغولی اور درد و محبت کی گرم بازاری کی یاد تازہ کرتی ہے۔ (۲)

سلسلہ احسنیہ (آدمیہ مجددیہ نقشبندیہ) سے انتساب و اجازت

حضرت سید آدم بنوری (۳) اگرچہ حضرت مجدد کے طریقہ عالیہ کے خوشہ چیں اور ان کے آغوش تربیت کے پروردہ ہیں، لیکن اپنی استعداد عالی اور فطرت ارجمند کی بنا پر سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ میں بھی ایک خاص رنگ کے حامل اور ایک ذیلی طریقہ کے بانی ہیں، جس کو بہت سی مجتہدانہ خصوصیات کی بنا پر "طریقہ احسنیہ" کے نام سے موسوم کیا

(۱) تاریخ مشائخ چشت صفحہ: ۲۴۴ (۲) ہو تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ سوم: ۴۸، ۴۹

(۳) شیخ عارف ولی کبیر حضرت آدم بن اسماعیل بن بہوہ بن یوسف بن یعقوب بن حسین حسینی کاظمی بنوری سلسلہ نقشبندیہ کے مشائخ کبار میں ہیں، حضرت مجدد الف ثانی امام احمد بن عبدالاحد سرہندی سے ان کی خدمت میں ایک مدت رہ کر طریقت کی تحصیل کی، کسی سے علمی تحصیل نہیں کی تھی، اس طرح آپ امی تھے، ۲۳/شوال ۱۰۵۴ھ میں مدینہ منورہ میں جہاں ایک سال پہلے ہجرت کی تھی، وفات پائی، اور جنت البقیع میں قبہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس مدفون ہوئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: "ان سے لاتعداد خلق خدا فیضیاب ہوئی، کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پر چار لاکھ مسلمانوں نے اتباع سنت محمدیہ پر بیعت کی، اور ایک لاکھ طالبین خدا ان کے ذریعہ علم و معرفت کے بلند مقام پر پہنچے، کہا جاتا ہے ان کی خانقاہ کسی دن ایک ہزار آدمیوں سے خالی نہیں رہتی تھی، اور سب کا کھانا آپ ہی کے لنگر سے آتا، اور سب یکسوئی کے ساتھ روحانی و باطنی استفادہ میں مشغول رہتے"۔ (المرتضیٰ: ۴۰۲، بار دوم) (محمود)

گیا ہے، حکمت الٰہی کی یہ جلوہ گری تھی کہ جس خانوادۂ عالی کی بنیاد ایک امی کے ہاتھ سے پڑی اس کے حصہ میں ہندوستان کے ممتاز ترین علماء محدثین، اساتذۂ وقت، ناشرین کتاب وسنت، داعی و مصلح، عظیم مدارس دینیہ کے بانی اور مصنف و محقق آئے، اور وہ اس بارے میں بھی اپنے جد امجد کی سنت کے پیرو اور ان کی میراث کے وارث ہیں، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز، داعی الی اللہ و مجاہد فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید، مسند الہند حضرت شاہ اسحاق دہلوی، بانی دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی، عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی اسی سلسلہ احسنیہ کے شیوخ کبار کے ذریعہ طریقہ مجددیہ نقشبندیہ میں داخل اور اس میں صاحب اجازت وخلافت ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے طرق تصوف کے مبصر اور نسبتوں کے رمز شناس حضرت سید آدم بنوری کے متعلق بڑے بلند الفاظ لکھتے ہیں اور ان کو سلوک واحسان کے فن کے مجتہد اور مستقل سلسلوں کے بانیوں میں شمار کرتے ہیں۔

حضرت سید آدم بنوری کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور ان کا استقصاء مشکل ہے، نزہۃ الخواطر میں حسب ذیل حضرات کے نام آئے ہیں، جن کو حضرت سید آدم بنوری سے نسبت وارادت اور ان میں بعض کو خلافت واجازت حاصل تھی، دیوان خواجہ احمد نصیر آبادی (م ۱۰۸۸ھ) شیخ بایزید سوری (م ۱۰۹۰ھ) شاہ فتح اللہ سہارنپوری (م ۱۱۰۰ھ) شیخ سعد اللہ بلخاری لاہوری (م ۱۱۰۸ھ) لیکن ان کے سلسلہ کی اشاعت حسب ذیل چار خلفاء سے ہوئی، جو ان کی مجتہدانہ تربیت وتعلیم کا نمونہ اور ان کی یادگار تھے، حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی (۱۰۳۳-۱۰۹۶ھ) حضرت شیخ سلطان بلیاوی، حضرت حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی، شیخ محمد شریف شاہ آبادی۔

حضرت شاہ علم اللہ (۱) کے خاندان میں سلسلہ احسنیہ مسلسل طریقہ پر جاری رہا،

---

(۱) حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی عقیدۂ توحید میں بڑے متصلب اور اتباع سنت میں بے نظیر عالم وشیخ طریقت تھے، حضرت سید احمد شہید کے جد رابع اور صاحب کتاب (باقی اگلے صفحہ پر)

جس میں آپ کے فرزند چہارم حضرت سید محمد (۱۱۵۶ھ) ان کے صاحبزادہ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب (م۱۱۹۲ھ) حضرت سید محمد صابر بن سید آیت اللہ بن شاہ علم اللہ (م۱۱۶۳ھ) حضرت شاہ ابوسعید بن سید محمد ضیاء ابن سید آیت اللہ بن علم اللہ (م۱۱۹۳ھ) حضرت سید محمد واضح بن سید محمد صابر (۱۲۰۱ھ) مولانا سید محمد ظاہر حسنی (م۱۲۷۸ھ) مولانا سید خواجہ احمد بن یاسین نصیر آبادی (م۱۲۸۹ھ) اور حضرت شاہ ضیاء النبی (م۱۳۲۶ھ) بڑے پایہ کے بزرگ اور عالی مرتبت مشائخ گذرے ہیں، جن سے ہزارہا انسانوں کو ایمان واحسان کی دولت عمل بالشریعت اور اتباع سنت کی توفیق حاصل ہوئی۔

حضرت سید آدم بنوری کے دوسرے خلیفہ اجل حضرت شیخ سلطان بلیاوی تھے، (۱) افسوس کہ ان کے حالات وملفوظات محفوظ نہیں رہے، اب اس قصبہ میں ان کا خاندان آباد ہے، نتائج الحرمین سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید آدم کے خلفائے کبار میں تھے، اکثر ان کا نام حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے ساتھ آتا ہے۔

حضرت سید آدم بنوری کے تیسرے خلیفہ اجل جن سے ان کے سلسلہ کی سب سے زیادہ اشاعت ہوئی، حافظ سید عبداللہ اکبرآبادی تھے، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی (م۱۱۳۱ھ) انہیں کے خلیفہ اور تربیت یافتہ تھے (۲) حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کا سلسلہ جس میں

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)......حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کے جد سادس ہیں، ان کی بستی تکیہ کلاں، رائے بریلی، دائرہ شاہ علم اللہ کے نام سے موسوم اور علم وذکر سے معمور جگہ ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے یہاں تشریف لاکر اپنے جی لگنے اور یہاں ایک چلہ گذارنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ (ملفوظ: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "تذکرہ شاہ علم اللہ حسنیؒ"، مصنفہ: مولانا سید محمد الحسنیؒ (محمود)

(۱) بلیا اب لکھمیا ضلع بیگو اسرائے کے نام سے معروف مونگیر کے مقابل دریا کے دوسرے کنارہ پر ہے۔

(۲) تینوں بزرگوں کے لیے ملاحظہ ہو: "انفاس العارفین"، تصنیف: حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

حضرت سید احمد شہید اور پھر ان کے توسط سے حضرت حاجی عبدالرحیم شہید ولایتی، میاں جی نور محمد جھنجھانوی، اور ان کے توسط سے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی، اور ان کے خلفاء مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، پھر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی وساطت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کے خلفاء میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے خلفاء میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، بانی سلسلہ تبلیغ نظام الدین اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کوسلسلہ احسنیہ مجددیہ سے انتساب ہے، اور وہ اس طریقہ میں مجاز وصاحب ارشاد ہیں۔ (۱)

حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقہ وسلسلہ سے وابستگی

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ فرماتے تھے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ وہ بزرگ تھے جن کی وجہ سے ہم لوگ مسلمان ہیں اور اسلام پر پورا عمل کر رہے ہیں۔ (۲)

انہوں نے لکھا ہے کہ "اگر یہ صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہے) کہ قیامت تک اللہ تعالیٰ اس دین متین کی حفاظت کا کفیل اور ذمہ دار ہے تو ضرور بالضرور اس عالم اسباب میں قدرت اس کے لیے اسباب وذرائع مہیا کرتی رہے گی اور اگر یہ مسلم ہے (اور بے شک مسلم ہے) کہ ہر مذہب اور دین آسمانی کے لیے افراط، اہل غلو اور تحریف اہل فساد وبدع، تخریب اور استیصال کے باعث ہیں تو ہمیشہ ایسے لوگوں کے شدت دینے اور ان کی تاریکیوں کو محو کرنے کے لیے ایسے ایسے اہل ہمت وورع پیدا کرتی رہے گی جو کہ دین محمدی کے سرسبز باغوں کو ہر قسم کے آفات سے محفوظ کرتے رہیں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جناب

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت، جلد چہارم طبع قدیم، ص ۳۲۹-۳۹۶

(۲) خطبات علی میاں، جلد ہفتم، ص: ۲۴۰، فرید بک ڈپو، نئی دہلی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین میں ہر صدی کے سرے پر ایسی ہستیاں پیدا کرتا رہے گا جو کہ دین کی تجدید کرتی رہیں گی اور کسی قسم کی دین میں کمزوری کو روانہ رکھیں گے، ان بلاد مشرقیہ میں تیرہویں صدی میں اگر کوئی ہستی اس مجددیت کا مظہر ہو سکتی ہے تو یقیناً وہ حضرت امام الائمہ، مرشد الامہ محی السنہ قطب العالم حضرت مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی قدس سرہ العزیز کی عدیم النظیر ہستی ہے، جس نے جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں کو ان دیار سے نیست و نابود کر دیا، اور اہل بدعت و فساد کی رسوم قبیحہ کو اکھاڑ کر پھینک دیا، اور عملی سرگرمیوں اور اخلاص وللّٰہیت کی مساعی سے نفوس انسانیہ کو زندہ کر دیا، مسلمانوں میں جو سیاسی نظام ہونا ضروری اور مفید ہے، اس کی بنیادیں استوار کر دیں، اور وہ حقیقی خدمات ملت بیضاء کی سیاسیات وغیرہ میں انجام دیں جن کی نظیر سلف میں بھی کم پائی جاتی ہے، اس مقدس ہستی کے فیوضات اور آثار عظیمہ اتنے نہیں ہیں کہ صفحات و اوراق ان کا احاطہ کر سکیں، مگر اہل توفیق و سداد نے اپنی اپنی ہمت کے موافق مختلف تالیفات کے ذریعہ اپنے لیے صدقہ جاریہ اور پسماندوں کے لیے اسوہ حسنہ مہیا کر کے خرمن حسنات میں بیش بہا ذخیرہ کا اضافہ کیا"۔ (۱)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شیخ و مربی) کے الفاظ ہیں:

"مجھ کو حضرت سید احمد صاحبؒ کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی محبت و عقیدت ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بڑھ کر ہیں، باقی خدا جانے کون بڑھ کر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں، یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں یہ کہتا ہوں اللہ تعالیٰ تو ہی جانے، میں مجبور ہوں، شاہ صاحبؒ کے پہلے بھی اس

(۱) سیرت سید احمد شہیدؒ، پہلا ایڈیشن، از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

خاندان میں اتباع سنت تھا، مگر حضرت نے نہایت درجہ کا اتباع
کیا، ہندوستان میں نور پھیلا دیا"۔(۱)

اس زمانہ میں اللہ کے یہاں آپ کا طریقہ سب سے زیادہ مقبول تھا، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ان دیار مشرقیہ میں اس میں منحصر تھی، چنانچہ حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتیؒ جو اپنے وقت کے جلیل القدر شیخ وسالک اور سلسلۂ چشتیہ میں مجاز تھے، اور آپ کے سینکڑوں، ہزاروں مرید تھے، فرماتے تھے:

"مجھے کسی سے سلوک میں رجوع کی ضرورت نہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی اسی میں پاتا ہوں کہ میں سید صاحب سے بیعت ہو جاؤں"۔(روایت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی)(۲)

حضرت سید صاحبؒ کی طرف مشائخ وعلماء کا رجوع

سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے دونامور شیخ حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی اور آپ کے خلیفہ میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی آپ سے بیعت ہوئے، اور آپ کے رنگ میں رنگ گئے، حاجی صاحب بیعت کے بعد ہمیشہ خدمت میں رہے، یہاں تک کہ بالاکوٹ میں شہید ہوئے، اس سلسلہ کے دوسرے حضرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور ان کی جماعت کا تعلق تو آپ سے ایسا تھا جیسا کہ عاشق کو معشوق سے ہوتا ہے، شاہ ابوسعید صاحب جو خاندان نقشبندیہ مجددیہ کے سلسلۃ الذہب کا ضروری حلقہ اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کے خلیفہ تھے، عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہے، اور استفادہ کیا، سلسلہ قادریہ کے مشہور شیخ سید صبغت اللہ بن سید محمد راشد نے جن کا سلسلہ سندھ میں بہت مشہور و معمور ہے، آپ سے استفادہ کیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی حیات

---

(۱) سیرت سید احمد شہیدؒ، از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ص:۵۳۸

(۲) سیرت سید احمد شہیدؒ، از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ص:۵۳۹

ہیں آپ کے خاندان کے اہل علم وفضل نے آپ سے بیعت کی، مولانا محمد اسماعیل صاحب، مولانا عبدالحی صاحب، مولانا محمد یوسف پھلتی کے علاوہ شاہ اسحاق صاحب و مولانا یعقوب صاحب نے استفادہ وباطنی تعلیم حاصل کی، اس کے علاوہ تمام مشائخ و علماء آپ کی عظمت ومقبولیت پر متفق العقیدہ ومتفق اللسان ہیں، آپ کی محبت اہل سنت وصحیح الخیال جماعت کا شعار اور علامت بن گئی ہے، آپ کے متعلق وہی کہنا بالکل صحیح ہوگا جو بعض اہل علم نے آپ کے ہم نام امام احمد کے متعلق کہا ہے: "اذا رأيت الرجل يحب أحمد بن حنبل فاعلم أنه صاحب سنة" (جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمد بن حنبل سے محبت ہے تو سمجھ لو کہ وہ سنت کا متبع ہے)(۱)

شیخ ومرشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

عالم ربانی، شیخ کامل محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایک طرف شریعت وطریقت کے مجمع البحرین، محدث وفقیہ، ناشر سنت، ماحی بدعت، حدیث کے بلند پایہ مدرس وشارح، تصوف وسلوک میں مجتہدانہ مقام پر فائز، اعلائے کلمۃ اللہ اور جہاد کے جذبہ سے سرشار، دو عظیم مدرسوں (دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور) کے سرپرست، استاذ الاساتذہ، اور شیخ الشیوخ تھے، ایک طرف وہ تربیت وسلوک کی تعلیم دیتے اور اس سلسلہ میں مشائخ چشت سے (جن سے وہ نسبت باطنی رکھتے تھے) ذوق، معرفت اور درد ومحبت کی دولت سے ان کو حصہ وافر ملا تھا، دوسری طرف وہ مشائخ نقشبندیہ مجددیہ (جن سے ان کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذریعہ سے انتساب (۲) حاصل تھا) تمکین ووقار،

---

(۱) سیرت سید احمد شہید، جلد دوم، ص: ۵۵۰

(۲) مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں: سب مشائخ طبیب امت ہیں، اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اعتبار سے انہوں نے طریق رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے اور سب کا خلاصہ اتباع سنت ہے بعد کو لوگوں نے بدعتیں داخل کردی تھیں، ان کے مجدد حضرت سید صاحب ہوئے، مولانا نے دوسرے موقع پر مصلحین طریقت میں شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، مجدد الف ثانی، اور حضرت سید احمد شہید کا نام لیا ہے.................. (باقی اگلے صفحہ پر)

استقامت علی الشریعہ اور اتباع سنت کی دولت سے مالا مال تھے، ایک طرف وہ اپنے زمانہ کے مسلم فقیہ تھے، جو عام طور پر فقہ حنفی کے مطابق فتوی دیتے دوسری طرف حدیث کی تدریس میں ان کو وہ مقام حاصل تھا اور اس میں ان کا شغف اتنا بڑھا ہوا تھا کہ گنگوہ طالبان علم حدیث اور فضلائے مدارس کا ملجا و ماوی بن گیا تھا۔

جہاں تک عقائد و مسلک کا تعلق تھا، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کے پورے متبع ان کی ولایت و مقبولیت کے قائل و معتقد اور تقویۃ الایمان کے لیے سینہ سپر تھے، یہ گوناگوں اور بظاہر متضاد رنگ ان کی ذات میں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں، طبیعت کی یکسوئی اور گوشہ گیری کے باوجود وہ مسلمانوں اور اسلام کی فکر سے خالی اور ان مفید کاموں اور اداروں کی معاونت و سرپرستی سے بے تعلق نہیں تھے، جو ان کے مخلص دوستوں، رفقاء کار یا شاگردوں نے علم دین کی اشاعت اور تبلیغ و دعوت کے لیے قائم کیے وہ بیک وقت دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور کے سرپرست بھی تھے، اور ان کے اخلاقی و روحانی نگراں اور مربی بھی۔ (۱)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور کئی مواقع پر سید صاحب کو ان اکابر کے ساتھ مصلحین میں شمار کیا ہے۔
(سیرت سید احمد شہیدؒ، جلد دوم، ص: ۵۵۴-۵۵۵)

اور یہ بھی فرمایا کہ "بعد کے لوگوں نے بدعتیں داخل کردی تھیں، ان کے مجدد حضرت سید صاحب (سید احمد شہیدؒ) ہوئے جس سے جس کو عقیدت ہو اس کے طریقہ میں وہ داخل ہو جائے۔
حضرت (سید صاحبؒ) نے نہایت درجہ کو اتباع (سنت) کیا، ہندوستان میں نور پھیلایا، جو ان کی صحبت میں ایک گھڑی بیٹھا اس میں وہی رنگ آگیا، جس میں زیادہ اتباع ہو وہی ولی کامل ہے، میرا تو عقیدہ یہی ہے کہ سید صاحب اپنے پیر سے بڑھ کر ہیں۔
میرے دادا پیر میاں جی نور محمد صاحب حضرتؒ کے مرید تھے، اور ان کے پیر حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب بھی سید صاحب کے مرید تھے، یہ دو طریقے حضرتؒ کے سلسلہ کے ہیں، مجھ کو سب سے زیادہ حضرتؒ سے محبت و عقیدت ہے، میں اپنے قلب سے مجبور ہوں، یہ اللہ ہی کی طرف سے کوئی بات ہے۔" (روایت کردہ: حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نوراللہ مرقدہ)
بحوالہ: دہلی اور اس کے اطراف، ص: ۱۰۴-۱۰۵، مطبوعہ اردو اکیڈمی، دہلی) (محمود)
(۱) چودہویں صدی ہجری کے اوائل میں حفاظت دین، اشاعت علم.......... (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جیسے مخلص و جاں نثار، مطیع و منقاد، صاحب علم و فضل اور باکمال مریدین و خلفاء عطا فرمائے، ویسے (ہمارے ناقص علم میں اور کم سے کم اس دور میں) کم کسی شیخ طریقت اور مربی روحانی کو ملے ہوں گے ان ممتاز ترین مریدین و خلفاء میں جس کے حالات سنئے یا تذکرہ پڑھئے معلوم ہوتا ہے کہ بس یہی فرد فرید اور مرید رشید تھا، اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی ذات سے اس پر آشوب دور میں کہ الحاد و بے دینی کے ماحول میں بادل امنڈ رہے تھے، اور فتنے پانی کی طرح برس رہے تھے، ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کے قلوب کو زندہ، دماغوں کو صیقل اور اخلاق کو آراستہ کیا، کسی نے علم حدیث کی نشر و اشاعت اور اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا وسیع پیمانہ پر کام کیا، کسی نے تحریر عقائد اور اصلاح رسوم کا فرض انجام دیا، کسی نے قلوب کو عشق الٰہی اور حب نبوی سے نرم گرم کیا، اور ان کے ذریعہ سے ہزاروں بندگان خدا درجہ احسان کو پہنچے، کسی نے جذبہ جہاد و حریت کا صور پھونکا، اور اعلائے کلمۃ اللہ کی کوشش کی، کسی نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ دین و علم کی خدمت کی، ان میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں کامل اور ہمارے پورے احترام و توقیر کا مستحق ہے۔ (۱)

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تعارف میں ہم یہاں وہ عبارت نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جو تذکرہ علمائے ہند کی شاہکار کتاب "نزهة الخواطر" سے ماخوذ ہے، جو اعتدال و توازن اور عدل و انصاف اور حقیقت بیانی میں سیرت و سوانح پر لکھی گئی کتابوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے:

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) دعوۃ الی اللہ اور رد شرک و بدعت کا ایک بڑا مرکز وہ علاقہ بن گیا، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ سے علمی و معنوی انتساب رکھنے والے بزرگوں اور ان کے سلسلۂ درس سے مستفید ہونیوالے فضلاء اور حضرت سید احمد شہید قدس سرہ اور ان کی جماعت کا مسلک رکھنے والے مشائخ و علماء نے جابجا دینی مدرسے اور خانقاہیں قائم کی تھیں، کچھ ہی عرصہ بعد اس پورے سلسلہ کی قیادت و سرپرستی اسی سلسلہ کے ایک عالم ربانی، شیخ کامل، محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے حصہ میں آئی۔ (مقدمہ حیات خلیل: ۸)

(۱) مقدمہ حیات خلیل (مؤلفہ مولانا محمد ثانی حسنیؒ) از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ص: ۹-۱۰

"اتباع شریعت، پیروی سنت اور سلوک و معرفت میں بڑے بلند مرتبہ کے مالک اور بڑی خصوصیات کے حامل تھے، بدعت کی مخالفت، شعائر اسلام کا احترام، سنت کی ترغیب، حکم شرعی کی تلقین اور عزیمت پر عمل کرنے میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، حق کے معاملہ پر عمل کرنے میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، حق کے معاملہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے، منکرات پر کبھی خاموش نہ رہتے، دین کے مسئلہ میں ادنی تحریف برداشت نہ کرتے، شریعت کے معاملہ میں کبھی مداہنت گوارہ نہیں کرتے۔

تواضع ان کی فطرت، حق ان کی علامت اور نرمی ان کا شیوہ تھی، صحیح بات معلوم ہونے پر اپنی رائے واپس لینے میں انہیں کوئی عار محسوس نہ ہوتا تھا، علم و عمل، تعلیم و تربیت، تزکیہ نفوس، احیائے سنت اور محو بدعت میں وہ ہمیشہ آگے رہتے تھے۔

۹ر جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ر اگست ۱۹۰۵ء کو وفات ہوئی"۔ (۱)

استاد و مربی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی جو بعد میں شیخ

(۱) بصائر، ص: ۴۰۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلفاء و مسترشدین میں جن علماء و مشائخ نے مرجعیت حاصل کی ان میں ۱۔حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری (شیخ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ) اور ۲۔حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری (شیخ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی و حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ) ۳۔شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی اور ۴۔حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو نمایاں مقام ملا، اور ان کے فیوض و کارناموں کے اثرات دنیا کے چپہ چپہ میں پہنچے۔ (محمود)

الہند کے نام سے مشہور ہوئے ہندوستان کی جنگ آزادی، انگریزی حکومت کے خلاف صف آرائی اور ایک آزاد، منصفانہ اور دستوری حکومت کے قیام کے لیے ایثار و قربانی دینے والوں میں پیش پیش تھے، سلطان ٹیپو کو مستثنیٰ کر کے انگریز دشمنی میں کوئی دوسرا ان کا سہیم و شریک نظر نہیں آتا، وہ خلافت عثمانیہ کے جو اس وقت عالم اسلام کی قیادت کر رہی تھی اور خلافت کا جھنڈا بلند کیے تھی پرزور حامی اور بڑے مؤید تھے، آپ نے افغانستان کی حکومت کے ذمہ داروں اور عثمانی سلطنت کے فرمانرواؤں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، ۱۳۳۶ھ میں شریف حسین کی حکومت نے مدینہ منورہ میں آپ کو گرفتار کر کے انگریزی حکومت کے حوالہ کر دیا، جس نے ۱۹۱۷ء میں ان کو اور ان کے رفقاء اور بعض تلامذہ (مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حکیم نصرت حسین، مولوی سید وحید احمد) کو جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا، ۱۹۲۰ء تک ان حضرات نے مالٹا میں جلاوطنی کی زندگی گذاری، جمعیۃ العلماء کے بانی مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس قومی مسئلہ کے پرجوش داعی اور تحریک خلافت کے سرگرم رہنما تھے۔

اس انقلاب بلکہ حقیقت میں جنگ آزادی میں جس کو بھرپور عوامی تائید حاصل تھی اور ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ انگریزی حکومت کے خلاف برسرپیکار تھے اور ہندوستان کی تاریخ میں ایسا جوش وولولہ، ایسا قومی اتحاد، اتنی پرزور عوامی تائید اور ہندو اور مسلمانوں میں ایسی وحدت واجتماعیت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، مسلمان قائدانہ رول ادا کر رہے تھے، اور انگریزی حکومت کے خلاف عوام کو صف آراء کرنے میں اور ایک مضبوط و مستحکم محاذ کی تشکیل کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ (۱)

ان کثیر التعداد علماء نے جن میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند، مولانا احمد سعید صاحب (دہلوی) مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن

بصائر، ص: ۴۰-۴۱

لدھیانوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو جمعیۃ علمائے ہند سے وابستہ تھے، آخر تک کانگریس کا ساتھ دیا، اور اپنے پرانے موقف اور طرز فکر پر مضبوطی سے قائم رہے، ان میں سب سے پیش پیش مولانا حسین احمد صاحب مدنی تھے، جو انگریزوں سے نفرت و عداوت، ملک کی آزادی سے غیر معمولی شغف اور عشق اور اپنے اخلاص میں بجا طور پر اپنے شیخ مولانا محمود حسن صاحب (دیوبندی) کے جانشین تھے۔ (۱)

(۱) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، ص: ۱۴۰-۱۴۱

باب دوم

جامعیت، علمی رسوخ، تعلیم وارشاد اور قائدانہ کردار

پہلا تعارف

کسی صاحب کمال ہستی کے کمالات وخصوصیات، شخصیت وصفات کا تعارف کرانا اہل نظر کا کام ہے، لیکن کسی صاحب کمال شخصیت کے متعلق اپنے ذاتی مشاہدات، نقوش وتاثرات کے اظہار کے لیے خود صاحب کمال اور صاحب نظر ہونا قطعاً ضروری نہیں، ایک دہقانی اور ایک ہندی طالب علم بھی بڑے سے بڑے شخص کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرسکتا ہے اور ایک مبصر، مؤرخ اور سوانح نگار اس سے بعض ایسے بے تکلف حقائق اور واقعات اخذ کرسکتا ہے جو نامور معاصرین اور پرجوش معتقدین کے بیانات میں بعض اوقات نہیں ملتے۔

۲۸ء کی بات ہے لکھنؤ کی مشہور سفید بارہ دری میں آل پارٹیز کانفرنس ہورہی تھی، اور نہرو رپورٹ پیش تھی، شب کی نشست میں مرحوم تصدق احمد خان شیروانی نے کسی تجویز پر تقریر کی، اور اس میں کچھ اعداد وشمار پیش کیے، ان کی تقریر کے بعد ایک بزرگ کھڑے ہوئے، جبہ ودستار میں ملبوس، عربی مشلح اور ہندوستانی عمامہ، لیکن عجیب بات یہ کہ شیروانی مرحوم (جو ایک کہنہ مشق سیاسی لیڈر تھے) کے پیش کردہ بعض اعداد وشمار کی

تصحیح فرمائی، متجسس نگاہوں کا جواب تھا، "مولانا حسین احمد مدنیؒ"۔

اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک جلسہ میں جو طلبہ کے درس قرآن کی تکمیل کی تقریب مسرت میں منعقد ہوا تھا، مولانا کو خالص دینی و علمی تقریر کرتے سنا، جس میں آپ نے قرآن کے فضائل وآداب بیان کیے، اور اس کی توجیہ فرمائی کہ بعض فرقوں کو قرآن مجید کیوں یاد نہیں ہوتا، نیز قدیم نصاب درس میں معقولات کی زیادتی اور قرآن مجید کے درس ومطالعہ کی کمی اور اس کی حق تلفی پر تنقید فرمائی، ایک دوبار لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کی حج سے واپسی کے موقع پر زیارت کی، حافظہ پر زور ڈالا، تو یہی ابتدائی نقوش ابھرے، ایک سبزہ آغاز طالب علم جس نے عقیدت و ارادت کے حلقہ سے نمود ونشو ونما پایا ہو، اور سیاسی میدان سے نہ فطری مناسبت رکھتا ہو، نہ طبعی عمر ایک نامور عالم اور ایک معروف خادم قوم کی زیارت و دید سے اتنا ہی مشرف اور سعادت اندوز ہوسکتا ہے۔

برادر معظم مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنیؒ کا تعلق

۱۹۳۱/۳۲ء سے ہمارا مکان لکھنؤ میں مولانا کی مستقل قیام گاہ قرار پایا، راقم سطور کے برادر معظم حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبد العلی صاحب مدظلہ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ سے نسبت خاندانی کی بدولت بزرگان دیوبند اس خاندان کے افراد سے ہمیشہ سے محبت وشفقت و یگانگت کا معاملہ کرتے رہے ہیں، بھائی صاحب جب تک دیوبند میں رہے، شیخ الہند کے الطاف وعنایات سے سرفراز رہے، بیعت وارادت کا اگر کبھی خیال آتا تو نظر حضرت ہی کی طرف جاتی، ابھی اس ارادہ کی تکمیل نہیں ہونے پائی تھی کہ حجاز کا سفر اور مالٹا کی منزل پیش آگئی، واپسی میں بھی اس کا موقع نہیں مل سکا، اب اس ارادہ کی تکمیل اس سے ہوئی جس کو حضرت کے بہت سے ارادوں کی تکمیل کرنی تھی، لکھنؤ بہت سے اسباب وخصوصیات کی بناء پر قومی وسیاسی تحریکوں کا ایک بڑا

(غالباً سب سے بڑا) مرکز تھا، کانگریس سے لے کر معمولی کمیٹیوں اور سیاسی انجمنوں کے اجلاس لکھنؤ میں ہوتے تھے، اور مولانا کو اکثر ان میں شرکت کرنی ہوتی تھی، سیاسی انہماک کانگریس کے جلسوں اور کانفرنسوں کی ہمہ وقت شرکت بھی کبھی مولانا کے مزاج، افتادِ طبع اور معمولات میں فرق نہیں پیدا کر سکی، سیاسی رہنماؤں اور مندوبین کی قیام گاہ لکھنؤ میں عموماً بڑے ہوٹل، قیصر باغ کے پرانے محلات یا امراء کی کوٹھیاں ہوتی تھیں، مولانا کو اس ماحول سے کبھی مناسبت نہیں رہی، ان کو ایک سادہ بے تکلف، مخلصانہ قیام گاہ جہاں سے مسجد قریب ہو، اور جہاں معمولات آسانی سے پورے ہو سکتے ہوں، اور جہاں رہنے اور کھانے میں تکلفات نہ ہوں، ہزار درجہ پسند رہی تھی، ہمارا محلّہ بازار جھاؤلال ہمیشہ سے اس بارے میں ممتاز رہا ہے کہ وہاں صحیح العقیدہ و غریب مسلمان رہتے ہیں، والد صاحب (مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کی وجہ سے اور ندوہ کے تعلق سے یہ محلّہ اور اس کی مسجد ہمیشہ علماء و فضلاء کا مرکز رہی ہے، مولانا نے اس محلّہ اور ہمارے مکان کو لکھنؤ کے قیام کے لیے منتخب فرمالیا، اور آج بیس برس ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ بھی اس وضع داری اور معمول میں فرق نہیں آیا، ایسا بھی ہوا ہے کہ سلیم پور ہاؤس یا شاہی بارہ دری کے شاندار ایوان کے جلسہ اور مباحثوں میں ایک گھنٹہ شریک رہے، اور کھانا ہمارے "شیرازی" دسترخوان پر کھایا، خواہ کتنی دیر لگ جائے، مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے زمانہ میں، کسی حلقہ انتخاب میں تشریف لے گئے، دیر رات گئے تشریف لائے، معلوم ہوا ابھی کھانا نہیں کھایا، ماحضر تناول فرمایا، اور استراحت کی، اس گھر کی یہی ادا (سادگی) آپ کو پسند تھی، اگر کبھی کچھ تکلف کیا گیا تو شکایت فرمائی۔

مسلم پارلیمنٹری بورڈ، تحریک مدح صحابہ وغیرہ کے موقع پر آپ کا قیام کئی کئی دن مسلسل رہا، محدود و مختصر قیام گاہ اور سادہ طرز رہائش میں گھر والوں کو معزز مہمانوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع زیادہ ملتا ہے، جو چیز خاص طور پر

محسوس کی وہ دن میں ان کی شگفتگی، مستعدی و بیداری، ہر ایک کی طرف توجہ والتفات اور شب کو معمولات کی پابندی و مشغولی، ان آنکھوں نے متضاد مناظر بھی دیکھے، بعض مقامی تحریکوں میں عقیدت و ارادت کا جوش بھی دیکھا، ان کی نیازمندی اور اظہار جانثاری بھی دیکھا، پھر انہی آنکھوں نے زود رنج، طوطا چشم عوام کو سخت برہم اور مغلوب الغضب بھی دیکھا، اور ان کے ذمہ داروں کو تند و تلخ الفاظ رو در رو (منھ پر) کہتے بھی سنا، لیکن مولانا کی حالت یکساں پائی، بعض سیاسی تحریکوں کے زمانہ میں بھی مشاہیر کو نیازمندانہ حاضر ہوتے اور تعارفی و سفارشی خطوط لکھواتے بھی دیکھا، پھر ان کی تلخ نوائیاں اور احسان فراموشیاں بھی دیکھیں، اس کو تنقیدی ذہن کہیے یا حقیقت پر مبنی کہ طبیعت نے یہ محسوس کیا کہ آنے والوں اور بیٹھنے والوں میں مولانا کے اصل ذوق اور اصل فن سے استفادہ کرنے والے بہت کم نظر آئے، زیادہ وقت اشخاص یا جماعتوں کے تذکرہ یا سطحی تبصرہ یا تعویذ و دعا کی فرمائش میں گزرتا، مولانا اپنی فطری عالی ظرفی سے کسی کو گرانی یا ناگواری کا احساس نہ ہونے دیتے، مگر جہاں کوئی تصوف و سلوک کا کوئی مسئلہ پوچھتا یا کوئی علمی بحث چھیڑ دیتا یا اہل اللہ کا تذکرہ کرنے لگتا تو فوراً چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی، اور ایسا معلوم ہوتا کہ دل کا ساز کسی نے چھیڑ دیا۔

مولانا کی خدمت میں میری حاضری اور دیوبند کا قیام

صرف باہر ہی نہیں اس ناچیز نے مولانا کو اپنے مستقر پر بھی دیکھا، چار مہینے دیوبند قیام رہا، تقریباً مہینہ بھر خاص مولانا کے دولت کدہ پر، پھر اپنے اصرار سے دارالشفا کے ایک حجرہ میں (جو مولانا کے دروازہ سے متصل اور گذرگاہ پر واقع ہے) منتقل ہو گیا، یہ قیام گاہ بھی زیر سایہ ہی تھی، آتے جاتے ملاقات، چمن میں صبح و شام نشست و برخاست، اخبار بینی، صبح کی چائے میں پابندی سے حاضری، (جس کو مولانا نے شرط فرما دیا تھا) اس زمانہ قیام میں مہمانوں کی کثرت اور اس پر مولانا کی مسرت و بشاشت بچشم خود دیکھی،

مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی، مستقل مہمان خاصی تعداد میں الگ تھے، بعض اوقات خود اندر سے کھانا لاتے، مہمانوں میں ہر طبقہ کے لوگ تھے، ارکان جمعیت، مشاہیر علماء، سیاسی کارکن، نوجوان ورکر، جیل سے آنے والے خفیہ پولیس کے خفیہ اشخاص، بیعت کے خواہش مند، تعویذ کے طالب وغیرہ وغیرہ، یہیں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی زیارت ہوئی، کئی ہفتے ان کی ہمسائگی رہی، اوران کے محاسن کا علم ہوا، بخاری وترمذی کے درس میں شرکت کرتا تھا، مولانا کا استحضار اور مسئلہ مبسوط تقریر ان لوگوں کے لیے نئی بات ہے جو مولانا کی سیاسی مصروفیتوں اور سفروں کی کثرت سے واقف ہیں، ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل ۶۰/ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ تقریر جاری رہتی، اور مسئلہ کا مالہ و ماعلیہ، ائمہ کے اختلافات واختلاف مذاہب، اوران کے دلائل و ماخذ، متن واسناد رجال کی بحثیں، برجستہ اس سب پر مولانا کی قرأت حدیث، مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ اور دارالحدیث کی روحانی پرسکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے، اور گویا اس وقت بھی ”وبالسند المتصل منا الی أمیر المومنین فی الحدیث......“ کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، درمیان میں طلبہ کے سوالات کا (جن میں بعض غیر متعلق بھی ہوتے) تحمل کے ساتھ جواب دیتے جاتے، آخر سال میں درس کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا۔

یہ (۳۲ء) کا زمانہ تھا، مولانا کے سفر کے پروگرام پہلے سے مرتب ہوتے، اکثر جمعہ باہر ہی گذرتا، اللہ تعالیٰ نے جس طرح داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو موم کر دیا تھا، ”وألنا له الحديد“ مولانا کے لیے سفر سہل فرما دیا ہے

ع ما آب من سفر الا الی سفر

ترجمہ (ایک سفر سے لوٹتے نہیں دوسرے کہ لیے پابہ رکاب ہو جاتے)

مجھے قرآن مجید کی تفسیر کے مطالعہ کا شوق تھا، اس میں اشکالات پیش آتے تھے جو بعض مرتبہ کسی کتاب سے حل نہ ہوتے، مولانا نے جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت مرحمت فرمایا تھا کہ اپنے اشکالات کو پیش کروں، مگر تھوڑے ہی جمعے میرے حصہ میں آئے، مطالعہ کے لیے بعض سیاسی کتابیں حکومت خوداختیاری وغیرہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل عنایت فرمائے۔

ایک بڑا فائدہ اور برکت

دیوبند کے قیام کی برکت تھی کہ انگریزوں سے نفرت میں (جس کے جراثیم میرے اندر موروثی طور پر تھے) شدت پیدا ہوئی، بعد میں اس میں اتنا اضافہ ہوا کہ ایک انگریز ہی نہیں سارا یورپ ہی اس وقت کفر و مادیت کا علم بردار ہے، اور اس کے زوال کے بغیر دین و اخلاق کا عروج اور اسلام کی دعوت کا پھلنا پھولنا مشکل ہے، یہ صرف کسی ایک حکومت اور کسی ایک ملک کی غلامی کا سوال نہیں، سوال ایک پوری تہذیب، ایک مستقل نظام فکر، اور ایک عالمگیر دعوت کا ہے جو پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیمات اور ان کے نتائج و اثرات کے بالکل ضد واقع ہوئی ہے، وہ کیا وقت اور ماحول تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑے اضطرار سے یہ دعا کی تھی کہ ﴿رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ﴾ (یونس: ۸۸) یہ بات یورپ کے عالمگیر اقتدار اور اس کی سحرانگیز ترقی ہی کو دیکھ کر سمجھ میں آئی، انگریز مشرق میں اپنی لادین و مادہ پرست یورپ کا ایک کامیاب ایجنٹ تھا، اور ہم اہل مشرق کو سب سے پہلا اور سب سے بڑا واسطہ اسی سے پڑا، اس لیے اس سے ہماری نفرت بالکل قدرتی امر ہے، لیکن "الکفر ملة واحدة"

ع این خانہ تمام آفتاب است

اس تہذیب اور اس دعوت کے علم بردار امریکہ، روس اور خود ایشیا کے وہ لادینی ممالک اور ریاستیں ہیں، جنہوں نے یورپ کے نظام فکر اور نظام حیات کو پورے طور

پر اپنا لیا ہے، نیز یورپ سے عالم اسلامی کو جو دینی، ایمانی، اخلاقی نقصان پہنچا ہے وہ ان نقصانات سے کہیں بڑھ کر ہے جو غیر ملکی حکومت سے ان ممالک کو پہنچا ہے، بہر حال انگریز سے یہ مخصوص نفرت بھی قابل قدر چیز تھی، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس میں اس ماحول، مولانا کی صحبت اور مطالعہ کو خاص دخل تھا۔

دیوبند کے قیام میں میرے لیے دل بستگی کا واحد ذریعہ مولانا کی ذات گرامی تھی، میری ذہنی و تعلیمی پرداخت اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے لیے وہاں کے درسی و مدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا، لیکن مولانا کی ایک نگاہ التفات، ایک تبسم، کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا سارا بوجھ ہلکا کر دیتا، اور دل دیر تک اس کا مزہ لیتا رہتا۔

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی اور جائس و نصیر آباد کا ایک سفر اور میری رفاقت

رجب کے آخر یا شعبان کی ابتداء میں مکان واپس آگیا، مولانا کی آمد و رفت اور قیام کا سلسلہ جاری رہا، اور ہم لوگوں کو خدمت کا شرف حاصل ہوتا رہا، مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے زمانہ میں ایک حلقہ انتخاب میں معیت و ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا، مولانا ہمارے ضلع (رائے بریلی) میں دورہ کرنے والے تھے، مسلسل سفروں سے خستہ ہو رہے تھے، لوگوں کو اپنے کام سے کام ہوتا ہے، کسی کی صحت و راحت کی پرواہ نہیں کرتے، بھائی صاحب نے خستگی و تکان محسوس کر کے مجھے ساتھ کر دیا کہ رائے بریلی پہنچ کر ایک دو روز کے لیے اپنے یہاں (دائرہ شاہ علم اللہ) میں مولانا کے آرام کا اہتمام کرنا، اور اس کی کوشش کرنا کہ مولانا کچھ وقت سکون و راحت کے ساتھ گذاریں، جائس و نصیر آباد کے حلقہ میں دورہ تھا، کار کا سفر تھا، امیدوار صاحب بھی جو یوپی کے ایک مشہور مسلمان بیرسٹر ہیں ہمراہ تھے، اس سفر سے اندازہ ہوا کہ مولانا اس کام کو اپنا ایک دینی فرض سمجھ کر اور ایک عقیدہ و ارادہ کے ماتحت کر رہے ہیں، وہی بے غرضی، وہی مستعدی، وہی جفاکشی

جوایک سپاہی میں میدان جنگ کے اندر ہوتی ہے، جمعہ کی نماز، ایک قصبہ کی جامع مسجد میں پڑھی، خطیب صاحب حضرات دیوبند کی تکفیر کرنے والوں میں تھے، انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بعض بزرگوں کے متعلق بہت کچھ کہا، مولانا سنتوں سے فارغ ہوکر خاموش بیٹھے تھے، نماز ہوئی، خاموش تشریف لے آئے، سفر کے آخر تک کبھی بھول کر بھی خطیب صاحب کا تذکرہ نہیں کیا، امیدوار صاحب نے کھانے کا پر تکلف اہتمام کیا تھا (جیسا کہ امیدوار صاحبان کرتے ہیں اور حلقہ انتخاب کے مقررین توقع رکھتے ہیں) مولانا نے مجھے اپنے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں شریک کیا، اور اس قدر جلد ہاتھ اٹھالیا کہ میں سمجھ گیا کہ وہ قوت لایموت کے طور پر اس کھانے کا استعمال جائز سمجھتے ہیں، رائے بریلی میں ایک شب قیام فرمایا، حضرت شاہ علم اللہ (جدامجد حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مسجد میں دیر تک تنہا مراقب رہے، نکلنے کے بعد گھر میں کچھ دیر بیان فرمایا، جو محض عالم آخرت، عالم ارواح اور برزخ کی زندگی سے متعلق تھا، چلتے وقت اس مقام کے متعلق اپنے باطنی تاثرات کا اظہار کیا اور طویل قیام کی خواہش ظاہر کی جس کی مولانا کی مصروف و متحرک زندگی میں بہت کم گنجائش تھی۔

ایک ہنگامہ خیز دور

پھر وہ ہنگامہ خیز دور آیا جب مولانا کی رائے اور سیاسی بصیرت، عام مسلمانوں کی خواہش اور جذبات اور اس وقت کی مقبول قیادت کے سیاسی فکر سے بالکل مختلف تھی، مولانا نے پوری قوت اور بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا، تقسیم کے خطرات و نقصانات بیان کئے، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے خیالات کی دعوت و تبلیغ کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا، جابجا تقریریں کیں، متعدد رسائل و مقالات شائع کئے، اس وقت مسلمانوں پر ایک اعصابی کیفیت طاری تھی، جس کے دو بڑے محرک تھے، ایک برادران وطن کی تنگ نظری اور کم حوصلگی کا طویل و مسلسل تجربہ جو انگریزی حکومت میں

برسہابرس سے ہورہا تھا، چنانچہ اس تحریک میں وہی طبقہ پیش پیش تھا جس کو دفتروں، تعلیم گاہوں اور شہری زندگی میں اس سے سابقہ پڑتا تھا، دوسرا محرک مسلمانوں کی قومی قیادت کا مزاج تھا، اس لیڈرشپ نے مسلمانوں کے جذبات کو اتنا متحرک و مشتعل کردیا تھا کہ ان میں کسی مخالف رائے کے سننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی، اور کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے اور اس کے نشیب و فراز کے سوچنے کے وہ حال اور کیفیت ہی میں نہیں تھے، مولانا کے خلوص، عزم اور احساس فرض نے اس کیفیت کو جو ایک واقعہ تھا، تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ سپر ڈالنے سے انکار کردیا، اور انہوں نے اپنے عقیدہ اور ضمیر کے مطابق رائے عامہ کی اس طاقت کے سامنے کلمہ حق کہنے کو اپنا فرض اور افضل الجہاد سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ سفروں اور جلسوں میں وہ سب کچھ پیش آیا جو مولانا کی شخصیت، ان کی سابقہ خدمات، ان کے علمی و دینی مقام کے بالکل شایان شان نہ تھا، اس وقت ایک طبقہ تھا جو اس سطح کی چیزوں کے علاوہ باطنی کیفیات کا بھی ادراک رکھتا تھا، وہ ان واقعات سے جو مختلف مقامات پر پیش آرہے تھے سخت تکلیف محسوس کرتا تھا، اور مولانا کے علو مقام، للّٰہیت و بے نفسی کی کھل کر شہادت دیتا تھا، اور ان واقعات کو مسلمانوں کے حق میں مضر و نامبارک سمجھتا تھا، مجھے یاد ہے کہ ایک ایسی ہی مجلس میں جب سید پور کے اسٹیشن کا واقعہ کسی اخبار سے پڑھ کر سنایا جارہا تھا تو بعض اہل دل فرط تاثر سے رو پڑے، مشکل سے کوئی ایسا تھا جس کی آنکھیں نم نہ ہوں، اس وقت مولانا کی عقیدت و محبت اور ان کے خلوص و للّٰہیت پر اعتماد ایک جزیرہ سا بن کر رہ گیا تھا، جس کے چاروں طرف ناراضگی، برہمی، و بدنامی کا سمندر پھیلا ہوا تھا، جس کی موجیں اس جزیرہ کے کنارہ سے آکر ٹکراتیں، اور واپس جاتیں، اس جزیرہ پر وہ ہزاروں لاکھوں مسلمان آباد تھے جن کو اب بھی مولانا کے خلوص و للّٰہیت پر اعتماد تھا، اور جو اس پر ایمان رکھتے تھے کہ مولانا سے تمام اصحاب اجتہاد کی طرح خطاء اجتہادی تو ممکن ہے، لیکن خود غرضی، موقع پرستی، سربلندی اور قیادت کی خواہش، حب جاہ وہ چیزیں ہیں جن

سے اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بہت بلند کر دیا ہے، لکھنؤ میں ہمارا مکان بھی اس جزیرہ پر واقع تھا اور چونکہ لکھنؤ اس قومی تحریک کا بہت بڑا مرکز تھا اس لیے ہمیں بھی ناراضگی کی ان لہروں کا تجربہ کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۴۷ء کا انقلاب

آخر وہ دور آیا کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کے جذبات میں یہ تحریک پیدا کی تھی وہ ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی دنیا میں چلے گئے، مسلمانوں میں سخت مایوسی، مستقبل سے ناامیدی، اور اپنے بارے میں بے اعتمادی اور احساس کمتری رونما تھا، ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا، ہر شخص ایک یتیمی و کسمپرسی کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا، اب مولانا اور ان کے رفقاء کی جماعت تھی کہ انہوں نے مسلمانوں میں خود اعتمادی، مستقبل کی طرف سے اطمینان، اپنے وطن میں رہنے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم پیدا کرنے کی تبلیغ کی، شمالی ہندوستان اور بالخصوص یوپی جو ہندوستان کے مسلمانوں کا ذہنی، علمی (اور سیاسی مرکز ہے) کے مسلمانوں کی قسمت اور ان کے قیام کا انحصار یوپی کے مغربی سرحدی اضلاع (سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ) کے برقرار رہنے اور مسلمانوں کے اپنی جگہ قائم رہنے پر تھا، سہارنپور اور اس کے متصل اضلاع میں مقامی حالات اور مشرقی پنجاب کے قرب کی وجہ سے ترک وطن اور انخلاء کی طاقتور تحریک اور رجحان پایا جاتا تھا، علماء دیوبند اور سہارنپور کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان حضرات نے ترک وطن کی تحریک و ترغیب کا سختی سے مقابلہ کیا اور اس کو دینی و سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے اقدام قتل کا مرادف بتلایا، اور مسلمانوں کے روکنے اور ان کے قدم جمانے کی سخت جدوجہد کی، اس میں بھی مولانا کا بہت بڑا حصہ تھا، خود ان کے قیام نے پھر ان کی ایمان آفریں تقریروں نے ان اضلاع کے مسلمانوں میں دینی روح اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا، ترک وطن کا سلسلہ رک گیا، بہت سے لوگوں کو میری طرح یہ احساس ہوگا کہ مولانا کی صحت زیادہ جدوجہد کے لائق ہوتی، ماحول اور رفقاء

کچھ بھی مساعد ہوتے اور خلاف توقع حالات وواقعات نے طبیعت کو افسردہ اور دل شکستہ نہ کردیا ہوتا تو مولانا اب بھی اسی عزم اور طاقت کے ساتھ اس بدلے ہوئے دور کی رہنمائی کرتے اور وقت کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرتے۔

ولو أن قومي انطقتني رماحهم
نطقت ولكن الرماح أجرّت

جوانی کی بہترین طاقتیں، اور قلب ودماغ کی پوری توجہات اور ہمت قلبی انگریزی حکومت کے مقابلہ اور انگریزوں کے اخراج پر صرف ہوئی، جس کے لیے شیخ الہند کی صحبت اور تجربہ ومطالعہ نے آپ کو تیار کیا تھا، جب نیا انقلاب (۴۷ء) اپنے نئے تقاضوں اور ضرورتوں کے ساتھ آیا تو وہ عمر کے انحطاط، قویٰ کے اضمحلال اور مصروفیتوں کی زیادتی کا زمانہ تھا، اور عام طور پر یہ خیال غالب تھا کہ مسلمانوں کا اس ملک میں کسی نہ کسی طرح رہ جانا ہی ایک بڑی کامیابی اور فتح مندی ہے، اب یہ ان لوگوں کی خدمت وعزیمت کا زمانہ ہے جو اس انقلاب کے دوررس میں اثرات سے واقف ہیں، اور علمی وفکری طور پر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

دینی حمیت وغیرت اور جرأت وعزیمت

ایک جامع فضائل ہستی کے بارے میں یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اس کے فضائل وکمالات میں مرکزی اور نمایاں صفت کون سی ہے جس کو اس کی شخصیت کی کلید قرار دیا جائے، اور جس سے اس کی زندگی اور خصوصیات کو سمجھنا آسان ہوجائے، مولانا کو بہت سے لوگ ایک عالم اور محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک شیخ طریقت اور سالک کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک سیاسی رہنما اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو ان سب فضائل سے آراستہ کیا ہے، لیکن میری کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، جنہوں نے آپ کو آپ کے معاصرین

میں ممتاز بنایا ہے، ایک عزیمت، دوسرے حمیت، عزیمت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آپ نے علماء واہل درس کے حلقہ سے باہر قدم نکالا اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کی جو وقت کا اہم مسئلہ تھا، اور عین انگریزی حکومت کے عروج کے زمانہ میں اعلان حق کر کے "كلمة حق عند سلطان جائر" کے افضل جہاد کا شرف حاصل کیا، مالٹا میں اسیری کے دن گذارے، اور ہندوستان کے جیلوں میں مہینوں رہ کر سنت یوسفی ادا کی، اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے مقابلہ میں برسوں سینہ سپر رہے، یہاں تک کہ آپ کا مقصد پورا ہوا، پھر یہ عزیمت آپ کی پوری زندگی میں نمایاں ہے، فرائض کی ادائیگی، نوافل و مستحبات کی محافظت، مخالف ماحول میں معمولات کی پابندی، اس زمانہ میں بڑی استقامت ہے، وعدوں کے ایفاء، دور دراز کے جلسوں اور اجتماعات میں شرکت اور اس کے لیے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنا مستقل عزیمت ہے، پھر اس سب کے ساتھ دارالحدیث کے اسباق کی پابندی اور کتابوں کی تکمیل ایک مستقل مجاہدہ، مہمانوں کی میزبانی اور مختلف الطبائع اشخاص کے ساتھ معاملہ اور ان کی مزاجی خصوصیات کا تحمل مستقل جہاد، پھر مریدوں کی تربیت اور نگرانی، کثیر التعداد خطوط کا جواب دینا اور سب اس ضعف و پیری میں یہ سب آپ کی غیر معمولی عزیمت وعلو ہمت کی دلیل ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں "ان اللہ یحب معالی الأمور ویکره سفسافها" پر عمل کر کے دکھا دیا۔

حمیت آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے، اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا، جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک کہ انگریز اس ملک سے چلے نہیں گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جدوجہد میں یہی روح کام کر رہی تھی، اور یہی آپ کو سدا جوان، مستعد و سرگرم رکھے ہوئے تھی، اور اسی نے سینکڑوں، ہزاروں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا، یہی حمیت تھی جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ، اس جوش و ولولہ کے ساتھ

پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑ جائیں گے، اور الفاظ نہیں ہیں بلکہ شرارے ہیں جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں، یہی حمیت ہے جو کسی منکر شرعی اور خلاف سنت فعل کو ذرا بھی دیکھنے کی روادار نہیں اور جس کی حرارت اور آنچ پاس بیٹھنے والوں کو اکثر محسوس ہوتی تھی، جن لوگوں نے آپ کے اس جذبہ کو پہچان لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ حمیت آپ میں کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے، وہ بعض اوقات اس سے غلط فائدہ اٹھا لیتے، اسی طرح مولانا کی شرافت و مروت سے جو آبائی ورثہ اور سادات کرام کا شیوہ ہے، بہت سے لوگ غلط فائدہ اٹھا کر آپ کے مخلص محبین اور نیازمندوں کے لیے شرمندگی کا باعث بنتے، اور اپنی غرض براری کر کے اپنی ہوشیاری اور موقع پرستی کا ثبوت دیتے اور مولانا کی ذات کو نقصان پہنچاتے تھے۔ (۱)

جامعیت اور علمی رسوخ

افسوس یہ تھا یہ ایک ایسی جلیل القدر شخصیت کے حقیقی مقام اور اس کے علمی و عملی کمالات و محاسن معلوم کرنے کے ذرائع مفقود تھے، جو لوگ صحبت سے محروم رہے یا بعد میں آئیں گے ان کے لیے یہ جاننے کا موقع نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو کیسی جامعیت، علمی استحضار، مسائل سلوک و تصوف پر نگاہ اور علمی رسوخ عطا فرمایا ہے، اس کا اندازہ نہ آپ کو عوامی تقریروں سے ہو سکتا ہے، نہ آپ کے سیاسی مقالات و رسائل اور خطبات صدارت سے، بلکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ خطبات اور رسائل آپ کی ذات کے متعلق غلط فہمی اور کوتاہ فطری پیدا کرنے کا باعث ہوں، اس لیے کہ آپ کی ذات اس سے کہیں زیادہ جامع اور وسیع ہے جیسی ان کا آثار علمیہ و سیاسیہ میں نظر آتی ہے، صدیق محترم مولانا نجم الدین اصلاحی نے مولانا سے محبت و عقیدت رکھنے والوں پر بڑا احسان کیا اور آنے والے مؤرخین و سوانح نگاروں کی بڑی مدد فرمائی کہ مولانا کی

(۱) یہ مضمون "مکتوبات شیخ الاسلام" کے مقدمہ کا حصہ ہے جو پرانے چراغ حصہ اول صفحہ ۸۳-۱۰۰ میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے تذکرہ میں شامل ہے۔ (محمود)

ان خصوصیات سے بلاواسطہ اور باوثوق طریقہ پر واقف ہونے کا ایک ایسا ذریعہ پیدا کردیا جس سے زیادہ مستند اور یقینی ذریعہ عرصہ تک کی رفاقت ومعیت کے بعد کوئی اور نہیں ہوسکتا، مولانا کے مکتوبات کا مجموعہ اس وقت تک مولانا کی شخصیت وسیرت اصلی خیالات وافکار حقیقی، ذوق ومزاج اور دینی وعلمی خصوصیات کا سب سے زیادہ جامع مرقع ہے جو منظر عام پر آیا ہے۔[1]

مسلسل جدوجہد اور سرتاپا قربانی زندگی

مجھے اپنی ایک پرانی عربی تحریر یاد آئی، جو غالباً (۴۲/۱۹۴۱ء) کے لگ بھگ لکھی گئی ہوگی، دارالعلوم کے طلبہ نے عربی کا ایک رسالہ "الأخلاق" کے نام سے نکالا تھا، اس کا وہ مولانا "حسین احمد نمبر" نکالنا چاہتے تھے، انہوں نے اس تاخیر سے بھی اس کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی، یہ فرمائش چونکہ دل کی خواہش کے مطابق تھی، بغیر کسی تکلف وتکلیف کے ایک مضمون عربی میں لکھ کر ان کو بھیج دیا گیا، جس کا عنوان تھا "صلتي بمولانا حسين أحمد المدني صفحة من صفحات حياتي" (مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے میرا تعارف وتعلق اپنی تاریخ کا ایک ورق) یہ نمبر نکلنے کی تو شاید نوبت نہیں آئی، مگر اس بہانہ سے وہ مضمون لکھ لیا گیا، اس میں اپنے دیوبند جانے اور وہاں کے قیام کے تاثرات اور مولانا کی شخصیت کے جو نقوش قلب ودماغ پر مرتسم ہوئے تھے ان کو اجاگر کیا گیا ہے، جی چاہا کہ اس کا آخری پیراگراف یہاں بھی نقل کردیا جائے، اس لیے کہ بحمد اللہ اب بھی اس میں ایک نقطہ کی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی:

"أما الشيخ فلا أزال على صلة به وأجدد المهد بأنفاسه ومجالسه واتفق لي بعد ذلك أن صحبته في السفر فانكشفت لي ناحية مهمة من نواحي الحياة الانسانية، وقرأت صفحة

(۱) از مقدمہ "مکتوبات شیخ الاسلام" مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی مرحوم (محمود)

جديدة من صفحات حياته، أطالها الله والانسان فى السفر غيره فى الحضر ولكنى رأيته فى بيته بل وأجمل نزاهة الأخلاق وعفة بطن، وعلو همة وشهامة نفس وصبر لا يعرف السامة والملل وهمته لا تعرف القتور والكسل سهر فى طاعة ويقظة فى شغل ونومه فى اعتدال وبكلمة فى اقتصاد وحياة كلها جد و اجتهاد وتضحية وجهاد".

(مولانا سے بحمد اللہ میرا ربط و تعلق قائم ہے، اور مجھے ان کے انفاس و مجالس سے استفادہ کے مواقع وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں، مجھے ان کے ساتھ سفر میں رہنے کا اتفاق ہوا تو انسانی زندگی کا ایک اہم گوشہ بھی سامنے آگیا، اور میں نے ان کی مبارک زندگی کا نیا ورق بھی مطالعہ کیا، انسان اکثر سفر میں اس سے مختلف نظر آتا ہے جیسا قیام کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے، لیکن میں نے ان کو سفر میں ویسا ہی پایا جیسا وہ گھر میں نظر آتے ہیں، بلکہ کچھ بڑھا ہی ہوا پایا، پاکیزہ اخلاق، محتاط و خوددار، بلند ہمت وعالی حوصلہ، ایسے جفاکش کہ اکتانا اور گھبرانا جانتے نہیں، ایسے جواں ہمت کہ سستی اور کسل مندی کے پاس نہیں جاتے، بیدار ہوں تو طاعت اور کام میں مشغول آرام فرمانا، کھانا تناول فرمانا سب بقدر ضرورت ان کی زندگی مسلسل جد و جہد اور سرتاپا قربانی و مجاہدہ ہے)(۱)

علمی مذاق اور رہنمایانہ کردار

اپریل ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ جلسہ لکھنؤ میں ہوا، مندوبین و مہمانوں کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں تھا، مجھے خیال ہوا کہ اگر اس موقع پر

(۱) یہ مضمون ۱۴/ صفر ۱۳۷۳ھ کو لکھا گیا جو "مکتوبات شیخ الاسلام" مرتبہ: مولانا نجم الدین اصلاحیؒ کے مقدمہ کا حصہ ہے۔ (محمود)

معزز و ذی علم مہمانوں کی ضیافت طبع کے لیے طلبہ کی انجمن "الاصلاح" کی طرف سے ایک علمی و تاریخی نمائش کا انتظام کیا جائے تو ہر طرح موزوں و برمحل ہوگا، اس وقت عزیزی مولوی طیب عثمانی "الاصلاح" کے ناظم تھے، میں نے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی عربی تصنیفات "نزہۃ الخواطر" کی آٹھ جلدوں اور "معارف العوارف فی أنواع العلوم والمعارف" کی مدد سے ایسے تاریخی معلومات افزا چارٹ تیار کیے، جن کو دیکھنے سے ایک نظر میں معلوم ہو جاتا تھا کہ ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد میں ہر علم وفن میں کون کون سی اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں، علمائے ہند کی وہ تصنیفات کون سی ہیں جو بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ میں ان کی امتیازی شان ہے، ہندوستان میں کس کس دور میں کون کون سے علمی و روحانی مرکز تھے، اور کہاں کہاں بڑے مدارس قائم ہوئے، نظام و نصاب تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں، مختلف زمانوں میں کیا کیا معیار فضیلت رہے، غرض چند نقشوں میں ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کا ابھرا ہوا خاکہ اور ہزاروں صفحات کا عطر کھینچ کر آگیا تھا، سینکڑوں آدمیوں نے اس علمی نمائش کی سیر کی لیکن اس سے سب سے زیادہ دلچسپی دو صاحبوں نے لی، ایک صدر جلسہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی (1) نے اور دوسرے

---

(1) "حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو نواب علی حسن خاں صاحب کے زمانہ ہی سے ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں شرکت کی دعوت دی جاتی رہی تھی، مگر وہ اپنی مصروفیات کے سبب غالباً کسی جلسہ میں شریک نہیں ہو سکے، ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں حضرت مولانا کا ندوہ سے قریبی ربط قائم ہوا، اور برابر بڑھتا گیا، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی نے "حالات ندوہ" کے تحت حضرت مدنی کی آمد کے بارے میں تحریر کیا:

"جناب مولانا حسین احمد صاحب نے مدرسہ کے عام معائنہ کے علاوہ انجمن الاصلاح کے جلسہ میں ایک بڑی مؤثر اور ایمان آفریں تقریر فرمائی، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

آپ نے فرمایا کہ انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے، جسم کی طرح روح بھی بیمار ہوتی ہے، اس کا علاج صرف انبیاء علیہم السلام کے یہاں ہے، اس کے بعد دنیا کے موجودہ حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اب یہ بات آشکارا ہو چکی ہے...... (باقی اگلے صفحہ پر)

ڈاکٹر سید محمود صاحب نے، ڈاکٹر صاحب اس وقت بہار کے وزیر تعلیم تھے، انہوں نے از راہ قدر دانی پٹنہ جا کر اپنے محکمہ کی طرف سے انجمن ''الاصلاح'' کو دو سو روپے بھجوائے۔ (۱)

اتاترک کے بارے میں حقیقت حال کا اظہار اور مولانا مدنیؒ کی حق پسندی

ہندوستان واپسی کے بعد میں نے اپنی تقریروں اور گفتگوؤں میں کمال اتاترک کے بارے میں اپنے تاثرات کا بے تکلف اظہار کرنا شروع کر دیا، اور وہاں کے اسلام پسند طبقہ کا عام طور پر اس کے متعلق جو خیال تھا اور اس کی ''اصلاحات'' سے اسلام کو ترکی میں جو نقصان پہنچا تھا اور جو معنوی روحانی و علمی نسل کشی (GENOCIDE) عمل میں آئی تھی اس کو صاف صاف بیان کرنا شروع کر دیا، تنہا رسم الخط کے بدل جانے سے جو انقلاب عظیم برپا ہو گیا تھا جس کو فلسفی مؤرخ ٹوئن بی (Toyn Bee) نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ''اب کسی ملک کے ذخیرۂ کتب یا عظیم کتب خانہ کے جلانے کی ضرورت نہیں (جس سے مفت بدنامی ہو) کسی قوم کا رسم الخط بدل دینا کافی ہے''، میرا تبصرہ اور تنقید ان حلقوں پر بڑی گراں گزری جو کمال اتاترک کو ترکی کا نجات دہندہ اور عظمت انسانی و خدمت اسلامی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر رکھتے تھے،

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) کہ انسان کے خود ساختہ نظام خواہ وہ کسی ازم کی شکل میں ہوں، انسانیت کے لیے سخت مضرت رساں ہیں، آج دنیا ان ہولناکیوں سے لرزہ براندام اور زمین ان کی خونریزیوں سے لالہ زار ہے، انسان کی نجات اسی الٰہی نظام میں ممکن ہے جو اسلام کے نام سے دنیا کو بخشا گیا ہے، تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ اسلامی نظام نے گنتی کے چند برسوں میں دنیا کی کایا پلٹ دی عرب کے بدو جن کے ہاتھوں میں کبھی اونٹ کی مہار رہا کرتی تھی، اب سیاست و جہانبانی کا علم لے کر آگے بڑھے اور دفعتہً سارے عالم پر چھا گئے'' (تاریخ ندوہ، حصہ دوم، صفحہ: ۴۱۰-۴۱۱)
(محمود)

(۱) پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ۳۷۸

اورانہوں نے برملا مجھ سے ناگواری اور ناراضگی کا اظہار کیا۔

اس کے برخلاف واپسی کے قریب ہی زمانہ میں مولانا مدنیؒ لکھنؤ تشریف لائے، میں نے ترکی کے سفر کے حالات وتاثرات بیان کیے، اور اتاترک کی اسلام کُش پالیسی کا ذکر کیا، مولانا نے ایک لفظ بھی اس کی حمایت میں نہیں فرمایا اور نہ چہرہ پر ادنی درجہ کی ناگواری ظاہر ہوئی، ایسا معلوم ہوا کہ ان کے قلب سلیم نے فوراً ان حقائق کو تسلیم کرلیا اور ان کا عمل "درمع الحق حیث دار" پر ہے۔ ؏

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

مجھ پر مولانا کی اس حقانیت وربانیت کا بڑا اثر ہوا کہ ان کے نزدیک معیار اسلام ہے، نہ سیاسی کامیابیاں، نہ جنگی فتوحات، نہ مغربی طاقتوں کو چیلنج کرنا یا نقصان پہنچانا۔

افسوس ہے کہ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی (دسمبر ۱۹۵۷ء) میں مولانا نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، میں وقتاً فوقتاً معتقدانہ حاضر ہوتا تھا، وفات سے صرف ایک ہفتہ پہلے بھی بغرض عیادت حاضر ہوا، مولانا کے اخلاص واخلاق اور ان کی سیرت کی مرکزی صفت اور کمالات کے مرکزی نقطہ "عزیمت وحمیت" کا ہمیشہ قائل رہا، اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں تردد پیدا نہیں ہوا۔(۱)

(۱) کاروان زندگی، جلد اول، صفحہ: ۴۳۶-۴۳۷

باب سوم

انسانی واخلاقی بلندی اور استقامت وشجاعت

انسانی حقیقت وشخصیت

کبھی بچپن میں یہ قصہ پڑھا تھا کہ "بالشتیوں" کے دیس میں کسی طرح ہماری اس دنیا کا ایک بلند قامت انسان پہنچ گیا تھا جو عرصہ تک ان کے لیے خوف ودہشت اور تعجب و حیرت کا سامان بنا رہا، اس کی شخصیت عرصہ تک ان کے لیے ایک معمہ اور اس کی بلندی خود اس کے لیے ایک آزمائش بنی رہی، ہم کو معلوم نہیں کہ بالشتیوں (PYGNIES) کی یہ بستی کہاں واقع ہے؟ بظاہر ایک ادیب اور افسانہ نویس کی انشا پردازی اور نازک خیالی سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں، لیکن اگر آپ نظر غائر سے دیکھیں گے تو یہ خود ہماری اس انسانی بستی کا ایک واقعہ نظر آئے گا جس پر افسانہ کا دھوکہ ہوتا ہے۔

اگر انسان صرف جسم کا نام نہیں اور اس کی بلندی و برتری کا معیار اس کا قد و قامت اور طول وعرض نہیں بلکہ انسان اس پیکر اور قالب کا نام ہے جس کے اندر انسانی حقیقت وشخصیت پائی جاتی ہے اور اس کی بلندی و برتری کا معیار وہ امتیازی اوصاف و اخلاق، سیرت و کردار ہے جس کی بناء پر انسان کو حیوانات اور دوسری مخلوقات پر شرف وفضیلت حاصل ہے، اور جن کے بغیر انسان محض منطق کا "حیوان ناطق" ہوکر رہ جاتا

ہے، تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہماری اس انسانی دنیا میں زیادہ تر بالشتیے ہی بستے ہیں، اور بالشتیوں کی اس بستی میں کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا بلند قامت مسافر آجاتا ہے، جس کی بلند شخصیت، بلند مقاصد و عزائم، بلند اخلاق و سیرت، ان کوتاہ قامت، کوتاہ فکر انسانوں کے ایک چیستاں اور خود اس کی زندگی ان کے درمیان ایک آزمائش و مجاہدہ بن کر رہ جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی مسافرت کے یہ دن پورے ہوں اور وہ اپنے دیس اور اپنے ہم سروں کے پاس واپس جائے۔

حقیقی آدمی

ہر زمانہ کے بلند خیال، بلند نظر انسانوں نے اپنے زمانہ میں آدمیت کی پستی اور ''آدمی'' کی نایابی کا شکوہ کیا ہے، اور اس سے انکار کیا ہے کہ آدمی کی شکل و صورت رکھتا ہے اور قیمتی لباس میں ملبوس ہے وہ ضرور آدمی ہے، ساتویں صدی کے مشہور عارف و حقیقت آشنا و مردم شناس بزرگ مولانا رومؒ نے صاف فرمایا۔

این نہ مرد اند اینہا صورت اند
مردہ نانند و کشتہ شہوت اند

(ترجمہ: یہ آدمی نہیں آدمی کی صورت میں یہ سب روٹی پر مرنے والے اور شہوت کے مارے ہوئے ہیں)

انہوں نے ایک منظوم حکایت کے پیرایہ میں حقیقی آدمی کے نایاب و عنقا صفت ہونے کو اس طرح بیان کیا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دو ملولم وانسانم آرزو ست
زیں ہمرہاں سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزو ست

(ترجمہ: کل شب ایک شیخ چراغ لے کر شہر کے گرد چکر لگا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں جانوروں اور چوپایوں سے تنگ آ گیا ہوں، مجھے انسانوں کی خواہش ہے، ان مست اور بیکار لوگوں سے میں دل گرفتہ ہوں، خدا کے شیر اور جنگل کے رستم کی آرزو ہے، میں نے کہا کہ اب یہ جنس دنیا میں ناپید ہے، انہوں نے کہا کہ جو چیز نایاب ہوتی ہے، مجھے اسی کی آرزو رہتی ہے۔)

خواجہ حافظ کو بھی اس کی بڑی شکایت ہے، بیش قیمت و زرنگار انسانی لباسوں میں بہت سے ایسے لوگ ملبوس نظر آتے ہیں جو حقیقت انسانی اور جوہر آدمیت سے یکسر عاری ہیں، وہ اپنی مشہور غزل "ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم" میں صاف کہتے ہیں:

حقوق زریں ہمہ در گردن نرمی بینم

(میں ہر مرد کی گردن میں سنہرا پٹا دیکھتا ہوں)

متنبی کا مشہور معاصر امیر نوجوان شاعر ابوفراس الحمدانی جس کو حقیقت میں جوہر شاعری و جوہر آدمیت دونوں میں متنبی پر فوقیت و ترجیح حاصل ہے اپنے زمانہ کے اکثر آدمی کا درندہ صفت انسانوں کے متعلق کہتا ہے:

ذئاب على أجسادهن ثياب

(بھیڑیے ہیں ان کے جسموں پر کپڑے ہیں)

پچھلے دور کی ادبیات کا ذخیرہ بھی اس شکوہ و شکایت اور اظہار حقیقت سے لبریز ہے، استاد ذوق نے ایک اصول اور تجربے کے طور پر کہا تھا:

آدمی کو بھی بہتر نہیں انسان ہونا

ہمارے عہد کے حکیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی مثنوی میں کہا ہے ؎

مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

(انسانیت دنیا میں افسانہ بن کر رہ گئی ہے، آدمی آدمی سے بیگانہ ہو چکا ہے)

انسانی پستی

اور یہ سب کسی قنوطی طرز فکر اور زندگی کے صرف تاریک پہلو کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے یہ نتیجہ ہے آدمی کے کسی بلند معیار کو سامنے رکھ کر معاصر انسانوں کے اخلاق و صفات کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور زندگی کے تلخ و دل شکن تجربوں کا جب بعض اہل نظر نے اپنے زمانہ کے معاشرہ پر ناقدانہ نظر ڈالی اور اپنے ہم عصروں اور زندگی کے ہم سفروں کے حالات کا گہرا مطالعہ کیا تو ان کو یہ نظر آیا کہ اکثر و بیشتر انسانوں کے اعمال و مساعی، جدو جہد اور تگ و دو کے اسباب و محرکات نہایت حقیر اور پست ہیں، اور ان میں سے اکثر پر مادی قسم کا معاشی نقطہ نظر اور نفع و افادہ کے بجائے انتفاع و استفادہ کی ذہنیت غالب ہے اور بہت کم انسان ہیں جو اس سطح سے کچھ بلند ہیں جن لوگوں کے ذہن نے اس تکلیف دہ مشاہدہ و تجربہ سے زیادہ چوٹ کھائی اور وہ اس مطالعہ کی تاب نہیں لاسکے، وہ پورے معاشرہ اور معاصر دنیا سے مایوس اور بیزار ہو گئے، اور ان کو ہر ایک طالب دنیا طالب دولت اور معاشی حیوان نظر آنے لگا۔

عہد عالمگیری کے ایک صاحب ذوق و صاحب فضل امیر حسین بن باقر اصفہانی الملقب بنواب امتیاز خاں نے اپنی ایک فارسی تضمین میں اپنی معاصر سوسائٹی کے تمام طبقات کا جائزہ لیا ہے اور ہر ہر صنف کے باکمالوں کے کمالات اور کوششوں کا ذکر کر کے فارسی کے کسی قدیم شاعر کے اس مصرعہ کو دہرایا ہے ؎

آن ہمہ از پیے آنست کہ زری خواہد

(یہ سب اس لیے ہے کہ اسے دولت چاہیے)

ان کے نزدیک شاہ و وزیر، مرد حکیم و دانا، تاجر و سوداگر، عالم و فاضل، ماہر علم الکیمیا طبیب و حکیم، خوش نویس و خطاط، ادیب و شاعر، یہاں تک کہ زاہد و صوفی سب کی جدو جہد و اظہار کمال کا مقصد صرف حصول دولت ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عمومی فیصلہ میں سخت مبالغہ اور غلو ہے، ممکن ہے یہ ان کا ذاتی تجربہ اور طبعی تاثر ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب کوئی چیز وبائے عام کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس سے صرف وہی اشخاص محفوظ رہتے ہیں جو نہایت قوی و توانا، تندرست ہوں یا ان کے پاس اس کے اثرات سے محفوظ رہنے اور اس کے جراثیم کو مارنے کی کوئی دوا یا تدبیر ہو، معاشیات کے بحران کے دور میں بھی وہی لوگ اس وبائے عام سے محفوظ رہتے ہیں جن کی سیرت کی تعمیر و تشکیل کا خاص اہتمام کیا گیا ہو، جن کا نفوس تزکیہ حاصل کر چکا ہو، جن کے سامنے انسانیت اور آدمیت خلوص و تجرد اور اخلاص وللہیت کے کچھ رفیع و عظیم الشان نمونے ہوں، جن کی روح کسی یقین سے سرشار اور کسی اور ذائقہ سے لذت یاب ہو چکی ہو، جس کے سامنے زندگی کی خوش حالیاں اور کامرانیاں ہیچ اور بے حقیقت بن چکی ہوں۔

انسانی بلندی کے معیار

عہد عالمگیر کے امیر شاعر نواب اقتیاز خاں خالص نے زندگی کا ایک ہی پہلو سے مطالعہ کیا اور اس نقطۂ نظر سے جب معاصر سوسائٹی کو دیکھا تو سب کو لیلائے دولت ہی کا قیس و مجنوں پایا لیکن ان کے زمانہ میں بھی اور ان کے زمانہ کے بعد خاص طور پر عشق و محبت، طلب و جستجو اور عبادت و بندگی کے لیے نئے نئے محبوب اور نئے نئے معبود تراشے گئے، ان میں سے ایک بت شہرت و ناموری ہے، ایک بت عزت و وجاہت ہے اور ایک بہت بڑا بت وزارت و حکومت ہے، جو لوگ زیادہ بلند حوصلہ، زیادہ بلند تر ہوتے ہیں اور جن کی غرض پرستی زیادہ دور اندیش اور ذہین واقع ہوتی ہے وہ طلب و دولت کی سطح سے زیادہ بلند ہو جاتے ہیں، اور شہرت و ناموری یا عزت و وجاہت کے طالب یا وزارت و حکومت کی راہ کے مسافر ہوتے ہیں یہ دولت کے پرستاروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ معزز نظر آتے ہیں اور نتیجہ میں ان سے بہت زیادہ کامیاب و کامران ثابت ہوتے ہیں، ایک عالم کا عالم اس نشہ میں سرشار اور ان بتوں کی بندگی و

عبادت میں گرفتار ہوتا ہے، اور جو دولت طلبی کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے وہ ان بتوں میں سے کسی نہ کسی بت کی زلف کا اسیر اور اس کے صید کا شکار ہو جاتا ہے اور جو کسی سیاسی کش مکش یا جنگ آزادی میں ان کے دام میں گرفتار ہونے سے بچ جاتا ہے اور مخلصانہ جد و جہد اور مردانہ سرفروشی کی مثال قائم کر دیتا ہے وہ جنگ آزادی کے اختتام اور ملک کے آزاد و با اختیار ہو جانے کے بعد انتفاع و استفادہ سے اپنے دامن خلوص کو پاک نہیں رکھ سکتا اور اس کی مجاہدانہ زندگی کا صحیفہ جد و جہد اور ایثار و قربانی کے تسلسل اور استغناء و بے نیازی کے دائمی نقش سے خالی ہوتا ہے، ایسا شخص جو معتصم کے تازیانوں اور متوکل کی نیاز مندانہ پیش کشوں اور عقیدت دونوں کا مقابلہ یکساں استقامت و شجاعت سے کرے اور اس کا دامن کسی وقت بھی داغ دار نہ ہونے پائے، دعوت و عزیمت کی تاریخ میں خال خال نظر آتا ہے اور جب بھی ہوتا ہے اپنے زمانہ کے لوگوں اور اپنے سفر کے رفیقوں میں ایسا ہی یگانہ اور بلند نظر آتا ہے جیسے چمن میں سرو آزاد، اس کو خدا کی طرف سے جو یقین اقلیم محبت کی طرف سے جو بے نیازی اور سرور، استادوں کی طرف سے جو استقامت نصیب ہوتی ہے اس کی بناء پر وہ زبان حال سے کہتا ہے

ملک دنیا تن پرستاں را ملال
ما غلام ملک عشق لازوال

(تن پرستوں کو دنیا کے ملک کا ملال ہے اور ہم عشق لازوال کے ملک کے غلام ہیں، اس لیے ہمیں کوئی ملال نہیں)

انسانی بلندی و رفعت کا منتہا یہی معیار نہیں کہ کسی انسان کا مقصد اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ رفیع و عظیم ہو، وہ دولت کا، شہرت و ناموری کا عزت و وجاہت اور وزارت و حکومت کا طالب و ساعی نہ ہو اور وہ کسی مرحلہ پر اپنی جد و جہد و قربانی کی قیمت وصول نہ کرے، یقیناً یہ ایک بلند اور بہت بلند معیار ہے، مگر انسانی بلندی کے کچھ اور بھی معیار ہیں، ان میں سے ایک معیار یہ ہے کہ جب اس کی دل سوزی اور درد مندی اس کی مخلصانہ جد و جہد اور ہمدردانہ، بے غرضانہ مشورہ کو ٹھکرا دیا جائے، اس پر

پست و ذلیل قسم کے الزامات لگائے جائیں، اس کی سب سے قیمتی متاع (ایمان وعقیدہ) اور اس کی سب سے عزیز متاع (شرافت و خودداری) کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے اور یہ سمجھا اور سمجھایا جائے کہ اس کی سرگرمی و جدوجہد کا محرک و باعث مالی طمع اور مادی منفعت ہے، اس کا دشنام طرازیوں اور سنگ باریوں سے استقبال کیا جائے تو وہ آزردہ اور برافروختہ نہ ہو اس کی طبیعت میں اشتعال اور اس کے دل میں جوش انتقام نہ پیدا ہو، وہ اس سب کے جواب میں کہے:

هنيئا مريئا غير داء مخامر

لعزة من أعراضنا ما استحلت

(عزہ ہماری عزت و ناموس پر جتنے حملے کرے اور جو بھی حلال جانے ہماری طرف سے اسے بخوشی اجازت ہے کہ وہ استعمال کرے اور اسے کوئی مرض بھی لاحق نہ ہو)

شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے بہت عرصہ پہلے مردان خدا کی یہ صفت بیان کی تھی کہ وہ دشمنوں کی بھی دل آزاری اور دل تنگی کے روادار نہیں۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں ہم نہ کروند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ باد و ستانت خلافست و جنگ

(میں نے سنا ہے کہ اللہ والوں نے دشمنوں کا دل بھی نہیں دکھایا، تمہیں یہ مقام بھلا کب حاصل ہوسکتا ہے جب کہ تمہارا تو اپنے دوستوں سے بھی اختلاف اور لڑائی ہے۔)

لیکن کیا اس سے بھی اونچا یہ مقام نہیں کہ ان دشمنوں اور دشنام طرازیوں کے لیے دعائے مغفرت کی جائے اور اپنے رب سے شب کی خلوتوں میں پورے خلوص

اور درد سے کہا جائے کہ

ع ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد

(ہمیں جس نے بھی تکلیف دی، میری دعا ہے کہ اسے بہت سکھ ملے)

یہ انسانی بلندی کا وہ معیار ہے جس پر صرف نائبین انبیاء اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب غلام فائز ہوتے ہیں

ع ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

(یہ لازوال دولت ہر ایک کو نہیں دیتے ہیں)

انسانی بلندی کا تیسرا معیار یہ ہے کہ انسان دوسروں سے نفع اٹھانے کے بجائے ہمیشہ نفع پہنچانے کی کوشش کرے، احسان مندی کے بجائے ہمیشہ اس کے بذل وعطاء جود وسخا کا ہاتھ کھلا رہے، وہ اپنے جذبہ احسان وخدمت میں "ساقی" کی فطرت و ہمت کا مظہر ہو، جس کی روایت یہ ہے کہ:

"أول الناس سقيا وآخرهم شرابا" اور "أكثر الناس سقيا وأقلهم شرابا"

(سب سے پہلے لوگوں کو پلانا اور سب کے آخر میں خود پینا، سب سے زیادہ لوگوں کو دینا اور سب سے کم خود لینا)

عرفی نے بہت عرصہ پہلے اپنے متعلق کہا تھا مگر درحقیقت یہ مردان خدا کی صفت ہے

عدیل ہمت ساقی ست فطرت عرفی

کہ حاتم دگراں وگدائے خویشتن است

(عرفی کی فطرت بھی ساقی کے حوصلہ کی ہمسر ہے کہ دوسروں کے لیے حاتم اور اپنے لیے فقیر ہے)

نسل انسانی کے بلندترین افراد (أرواحنا ونفوسنا فداه) نے یہ اصول بتایا تھا کہ "اليد العليا خير من اليد السفلى" (اونچا ہاتھ (محسن) نیچے کے ہاتھ (ممنون، احسان) سے بہتر ہے) اور اس اصول پر وہی عمل کرسکتے ہیں جن کے دل

سے دولت دنیا کی محبت اور مال کی قیمت نکل چکی ہو اور ان کی فطری یا آبائی شرافت و حوصلہ مندی اور جذبہ خدمت و احسان ان کے ہاتھ کو ہمیشہ اونچا رکھے، تکلف سے دو دن چاروں اس طرح زندگی گزارنا آسان ہے مگر ساری زندگی اسی اصول کے ماتحت گزارنا بڑے مزکی نفوس، بڑے عالی مقام انسان کا کام ہے۔

انسانی بلندی کا ایک معیار یہ ہے کہ علمی و روحانی و اخلاقی مدارج عالیہ پر فائز ہونے کے بعد بھی اور خواص کا شہادت و تزکیہ اور خلق خدا کے رجوع عام کے باوجود بھی اپنے نفس سے بدگمانی قائم رہے اور اپنے نقص کا استحضار اور اپنی بے جا عملی کا شکوہ رہے، سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ایک شیخ وقت حضرت نور قطب العالم پنڈویؒ کے متعلق پڑھا ہے کہ شب کی عبادت و گریہ زاری کے بعد اکثر ان کو یہ شعر بڑے درد سے پڑھتے ہوئے سنا گیا ہے ؎

ہمہ شب بزاریم شد کہ صبا ندارد دلے
نہ امید صبح بختم چہ کنم صبارا

(میری پوری رات اسی آہ و زاری میں گزر گئی کہ صبا کے پاس دل نہیں ہے، مجھے میرے بخت کے صبح ہونے کی امید نہیں ہے تو صبا میرے کس کام کی؟)

یہ مقام معرفت صحیح تزکیہ کامل اور فطری عالی ظرفی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، ورنہ اس زمانہ میں اور حقیقتاً ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہے ہیں جن کا سارا ادب ''انا'' اور ''انانیت'' سے بھرا ہوا ہے۔

انسانی بلندی کے اور بھی معیار ہوں گے یہاں اس موضوع پر کوئی مفصل مقالہ اور اس کا علمی جائزہ مقصود نہیں، راقم سطور کے ذہن اور تجربہ میں انسانی بلندی کے جو معیار آئے ہیں اور جن پر بہت کم لوگوں کو جن کو مادی اور علمی حیثیت سے بلند سمجھا جاتا ہے پورا اترتا ہوا دیکھا ان کا تذکرہ کر دیا۔

حضرت مدنیؒ کا مقام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ علمی و سیاسی حیثیت سے جس قدر بلند ہوں مجھے اس سے انکار نہیں، لکھنے والے ان گوشوں پر لکھیں گے لیکن میرے خیال ناقص میں ان کی جو حیثیت سب سے زیادہ روشن، ممتاز اور مسلمہ ہے وہ ان کی انسانی بلندی ہے۔

علمی دنیا ممتاز شخصیتوں اور وسیع النظر اور متبحر عالموں سے خالی نہیں ان کے سیاسی خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے انہوں نے اپنی بلند نظری سے ملک کی آزادی پر جو توقعات قائم کی تھیں اور اپنی فطری شرافت نفس و پاکیزگی سے اس ملک کی اکثریت کے متعلق جو اندازے لگائے تھے وہ کہاں تک صحیح ثابت ہوئے اور ان کو زبان، کلچر، مذہبی تعلیم اور پرسنل لا کے تحفظ کے بارے میں (جس کی کانگریس کے منشور اور بھارت کے دستور نے ضمانت دی تھی اپنی آخری عمر میں جو مایوسی ہوئی اور ان کے اپنی سیاسی جدوجہد کے رفیقوں اور جیل کے ساتھیوں کے متعلق (صاحب اختیار و اقتدار ہو جانے کے بعد) جو تلخ اور دل شکن تجربے ہوئے آج ان کو خواہ زبان پر نہ لایا جا سکے مگر آنے والے مؤرخ کے قلم کو ان کے اظہار سے نہیں روکا جا سکتا، مگر جو چیز ہر شک و شبہ اور ہر بحث و نزاع اور ہر اختلاف سے بالاتر ہے وہ ان کی بلند سیرت، پاکیزہ شخصیت، بے غرض جدوجہد، بے داغ زندگی اور مکارم اخلاق ہیں جنہوں نے ان کی ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنا دیا تھا اور ان کو اخلاقی و طبعی بلندی کے اس مقام پر پہنچا دیا تھا جس کے متعلق دور اول کے عرب شاعر نے کہا ہے:

هجان الحی کالذهب المصفی

صبیحة دیمة یجنیه جان

(قبیلہ کے شریف سردار ایسے کھرے سونے کی طرح ہیں جو کسی بارش کی

صبح کو زمین سے اٹھالیا جائے اور صاف کرلیا جائے)

اس راقم سطور کو مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور سفر و حضر میں مختلف حالتوں، رضا وغضب، مشغولیت وفراغت، جلوت وخلوت میں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، تقریباً ۱۹۳۰ء سے برادر معظم ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلی صاحب مدظلہ کی بدولت ہمارے لکھنؤ کے مکان کو مولانا کی فرودگاہ بننے کا شرف حاصل ہے، دیوبند کے ابتدائی طویل قیام اور بعد کے منتشر قیام میں مولانا کی زندگی، معمولات اور مزاجی خصوصیات نظر میں رہے۔

راقم سطور نے اپنی ایک تازہ تصنیف "المرتضیٰ" کے "پیش لفظ" میں "سخن ہائے گفتنی" کے عنوان سے ایک تلخ تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا، اس کا خفیف لفظی ترمیم کے ساتھ یہاں بھی نقل کردینا مناسب (اور درجات کے تفاوت کے ساتھ) حسب حال ہے، راقم نے لکھا تھا:

> "یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ بہت سی تاریخ ساز، عہد آفریں اور نادرۂ روزگار شخصیات ایسی بھی ہیں جن کی مکمل سیرت (جو ان کی روشن ترین مخصوصیات پر حاوی اور ان کے مرکزی اور اہم کمالات ومحاسن پر روشنی ڈالتی ہو) عرصہ دراز تک مرتب نہیں ہوتی، اور یہ بات ان کے ماننے والوں اور عقیدت مندوں پر ایک اخلاقی ودینی وعلمی قرض کی نوعیت رکھتی ہے، جس کی ادائیگی بعض اوقات انہوں نے بھی کی، جو ان کی تعظیم میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتے اور ان سے محبت ووابستگی کو سرمایہ افتخار وشرف سمجھتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ قرض ماہ وسال کی مختصر مدت میں ادا ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس پر طویل مدت گزر جاتی ہے"۔

یہی معاملہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ساتھ پیش آیا جن کی وفات ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں پیش آئی، لیکن تقریبا

نصف صدی گزر رہی ہے کہ ان کی سیرت و تذکرہ میں ابھی تک کوئی شایانِ شان کتاب ملک کے سامنے نہیں آئی۔

متفرق طور پر مختلف اہل تعلق اور عقیدت نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی اور ان کی سعی بہر حال مشکور ہے، (۱) لیکن ضرورت تھی کہ کوئی ذی علم فرد خاندان، یا خاندانی، تاریخی وسوانحی، اندرون و بیرون اور شب و روز کی زندگی کا واقف حال، اس وسیع اور نازک موضوع پر قلم اٹھاتا، اور اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ مستند مواد، چشم دید واقعات، اور مشاہدات و تجربات پیش کرتا۔

---

(۱) راقم کو اچانک یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ اسی خاندان والا شان کے ایک فرزند مولانا سید فرید الوحیدی صاحب جو حضرت مولانا کے حقیقی بھتیجہ مولانا سید وحید احمد صاحب مرحوم اسیر مالٹا کے صاحبزادہ ہیں، انہوں نے مولانا کا مکمل تذکرہ مرتب کر لیا ہے اور اس کی کتابت بھی ہو گئی ہے، مولانا نے ازراہ تعلق و محبت اور اس علم کی بنا پر کہ راقم اور اس کے خاندان کو حضرت مولانا سے گہری عقیدت کا تعلق ہے اس کو مولانا سے جزئی تلمذ کا شرف بھی حاصل ہے، اور اس کے برادر محترم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) مولانا کے دست گرفتہ اور گہرے عقیدت مند بھی رہے اور لکھنؤ میں ان کا مکان مولانا کی مستقل فرودگاہ اور جائے قیام تھا مجھ سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔

راقم نے اپنی شدید مصروفیت، کمزوری صحت اور مسلسل اسفار کے باوجود اس پر اجمالی نظر ڈالی اور اندازہ ہوا کہ اس تذکرہ میں کم سے کم وہ مواد اور معلومات زیادہ سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں، جو ایک واقف، متیقظ فرد خاندان ہی جمع کر سکتا ہے، یہ کتاب خاندانی حالات کا اچھا ماخذ ہے، اس میں اولین سفر حجاز کی دل دوز سرگزشت، قیام مدینہ طیبہ کے تفصیلی حالات، مدینہ طیبہ میں گھر کی عسرت اور معاشرت کا بولتا ہوا نقشہ، مالٹا کی اسیری کے بارے میں قیمتی معلومات (جن کا بڑا حصہ انہوں نے اپنے والد محترم سے سنا ہوگا) حضرت کے سوانحی حالات مثلاً: دیوبند کی طالب علمی کی تفصیلات، والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب کا قدرے تفصیل سے تعارف، اس کے ساتھ سیاسی شعور اور سرگرمیوں کی ابتداء تحریک خلافت کے آغاز کی بعض قیمتی تفصیلات و معلومات، برطانیہ اور عالم اسلام کے بارے میں اس کے کردار پر مفید مواد، اور مولانا کی دعوتی تحریک کی سرگرمیوں، مجاہدات و ابتلاءات پر قیمتی مواد جمع کر دیا گیا ہے پھر اخلاق و سیرت، معاشرت و تعلقات اور معاملات کے بارے میں وہ مفید اجزاء اور پہلو بھی آ گئے ہیں جو گھر کا کوئی فرد ہی پیش کر سکتا ہے۔

اخلاقی بلندی اور شخصیت کی دلآویزی

سیر وتراجم کے ذوق ومطالعہ پھر خصوصیت کے ساتھ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حکیم سید عبدالحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی جلیل القدر تصنیف یا کتب خانہ "نزھۃ الخواطر"(۱) کی آٹھ ضخیم جلدوں کے بار بار مطالعہ وخدمت نے شخصیتوں کو غور سے دیکھنے اور ان کی خصوصیات واخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے اور ان کو اسلاف کے معیاروں پر جانچنے کی عادت پیدا کردی، اس نقطۂ نظر اور اس افتادِ طبع کے ساتھ جب مولانا کو دیکھ کر انسانیت وآدمیت، شرافت وسیادت اور اخلاق وکردار کی بڑی بلندی پر پایا اور اسی چیز نے مولانا کی بلندی کا نقش دل ودماغ پر ایسا قائم کیا کہ جب کبھی ذہن وذوق نے ان کے کسی خیال یا کسی علمی تحقیق اور رجحان کا پورا پورا ساتھ دینے سے معذرت کی اور دماغ اس کو قبول نہ کرسکا، ان کی انسانی واخلاقی بلندی اور ان کی شخصیت کی دل آویزی آڑے آئی اور دیکھا تو عقیدت ومحبت میں کوئی کمی نہ تھی۔

مولانا کو انسانی بلندی کے ان چاروں معیاروں پر پورا پایا، اخلاق وبے غرضی ان کی زندگی کا جوہر اور ان کے تمام اعمال ومساعی اور سرگرمیوں کا محرک تھا، جس طرح بعض غیر مخلصین کے لیے کسی حالت اور کسی کام میں بھی مخلص بننا مشکل ہے عدم اخلاص اور غرض پرستی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، اسی طرح ان مخلصین کے لیے جن کی سرشت میں اللہ نے اخلاص رکھا ہے غیر مخلص بننا ناممکن ہوتا ہے، ان کی فطرت غیر اختیاری طریقہ پر اخلاص کی طرف چلتی ہے، وہ عمل جس کے اغراض کے ماتحت کرنے

---

(۱) یہ کتاب عربی میں ہے اور اس کا موضوع ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں کے حالات وسوانح ہے، اس میں پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک کے علماء، ادباء، شعراء، سلاطین و وزراء واہل کمال کے تذکرے ہیں، پوری کتاب میں پانچ ہزار کے قریب اعیان واہل فضل کے حالات آگئے ہیں، مولانا مدنی اس کتاب کے بڑے قدرداں اور مشتاق تھے۔

(پرانے چراغ: ۱/۹۵، طبع جدید)

کا رواج عام ہوتا ہے وہ بھی ان اغراض سے بالاتر ہو کر پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ انجام دیتے ہیں، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا نے جو سر فروشانہ اور قائدانہ حصہ لیا اور اس راستہ میں انہوں نے جو مصائب اور تکلیفیں برداشت کیں انہیں صرف انگریزوں کا (جن کو وہ اسلام اور مسلمانوں کا عدو اکبر سمجھتے تھے) ہندوستان کو آزاد کرانے اور اس کی آزادی سے ممالک اسلامیہ کے آزاد ہونے کی سبیل پیدا کرنے اور اس سب کے علاوہ اور شاید اس سب کے برابر اپنے اسلاف اور بزرگوں بالخصوص اپنے مربی و محبوب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے اتباع و اطاعت کا جذبہ کام کر رہا تھا، اس کے علاوہ کسی مادی منفعت اور ذاتی مصلحت کا تصور اور خطرہ بھی شاید ان کے دل میں نہ آتا ہو، چنانچہ جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور ملک میں حکومت خود اختیار قائم ہوئی تو وہ اپنے اصلی کام درس و تدریس اور تزکیہ و ارشاد میں ایسے مصروف اور سیاسی جد و جہد کے میدان سے ایسے کنارہ کش ہو گئے جیسے ان کا کام ختم ہو چکا ہو، صف اول کے قائدین میں میرے علم میں تنہا وہ ایک شخص تھے جنہوں نے اپنی پچھلی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہیں کی اور وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ جب ان کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے سب سے بڑا اعزازی خطاب عطا کیا گیا تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے صاف معذرت کر دی اگرچہ ان کی طبعی تواضع اور انکساری نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ "یہ ان کے اسلاف کرام کے شیوہ و مسلک کے خلاف ہے" مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنے دامن اخلاص پر خفیف سے خفیف داغ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اس فیصلہ نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا:

ع کہ عنقا را بلند است آشیانہ

نہ صرف سیاسی جد و جہد بلکہ انہوں نے اپنے کسی جوہر، کسی کمال، کسی متاع، اور کسی ہنر کی کوئی قیمت نہیں لی، جو لوگ حقیقت سے آشنا اور حالات سے واقف ہیں وہ

جانتے ہیں کہ دیوبند کی تنخواہ (جس کا مولانا اپنے دنیادار ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بار بار اظہار و اعلان کرتے تھے) وہ ان کے وسیع مہمان خانہ کے ایک ہفتہ بلکہ شاید نصف ہفتہ کا بھی خرچ نہیں تھی اور اس کا بڑا حصہ سفروں کی غیر حاضری کی بناء پر کٹ جاتا تھا، اور برائے نام وہ ان کے حصہ میں آتی تھی انہوں نے دراصل اپنی پوری زندگی احتساب و اخلاص میں گزاری، اور اخفائے حال کے لیے مدرسہ کی تنخواہ (جس سے بدرجہا زائد ان کے شاگردوں کو مل سکتی تھی) کا ایک پردہ ڈال رکھا تھا۔

انسانی بلندی کے دوسرے معیار یعنی "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ" اور "اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ" پر عمل کرنے اور دشمنوں سے نہ صرف درگزر کرنے بلکہ ان کو نفع پہنچانے اور ان کے حق میں دعائے خیر کو وظیفہ بنانے میں مولانا فرد فرید تھے، سید پور، بریلی، جالندھر اسٹیشن کے ان واقعات کے بعد جو انسانیت و شرافت کے ابتدائی حدود سے بھی متجاوز اور وحشت و رذالت کا نمونہ تھے مولانا کی زبان پر کبھی بھول کر بھی کلمہ شکایت یا اظہار حال نہیں آیا بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے تہجد و سحور کے وقت مولانا کو ان ناشناسوں کے حق میں گریہ و زاری کے ساتھ دعا کرتے سنا گیا ہے ان دشنام طرازوں، بدنام کرنے والوں اور خاک اڑانے والوں کو جب ضرورت پیش آئی ہے اور انہوں نے یا ان کے عزیزوں نے مولانا سے کسی سفارش یا خط کی فرمائش کی ہے مولانا نے بڑی بشاشت اور انشراح خاطر کے ساتھ پرزور الفاظ میں ان کی فرمائش پوری کی ہے اس موقع پر اگر کسی خادم یا رفیق نے ان کا تعارف کرانے اور ان کے پچھلے کارناموں کو یاد دلانے کی کوشش کی ہے تو اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کا عمل اس اسوہ نبوی پر تھا: "وَأَنْ أَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِيْ وَأَصِلَ مَنْ قَطَعَنِيْ وَأُعْطِيَ مَنْ حَرَمَنِيْ" یعنی مجھے میرے رب نے وصیت کی ہے کہ جو مجھ پر ظلم کرے اس کو میں معاف کروں، اور جو میرا مقاطعہ کرے میں اس کے ساتھ سلوک اور صلہ رحمی کروں جو مجھے محروم رکھے تو اس کو میں عطا کروں۔

عالی حوصلگی اور وسیع النظر فی

مولانا خاندانی یا ذاتی حیثیت سے کوئی رئیس و متمول شخص نہ تھے، مگر اللہ نے ان کو بادشاہوں کا سا حوصلہ اور ظرف دیا تھا، خدا مجھے معاف کرے میں نے غلط کہا کہ اہل اللہ اور تابعین کا سا حوصلہ عطا فرمایا تھا، "اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلیٰ" پر ساری زندگی عمل رہا بہت کم دوسروں کے ممنون ہوئے اور انہوں نے ایک عالم کو ممنون کیا، ان کا مہمان خانہ ہندوستان کے وسیع ترین مہمان خانوں اور ان کا دسترخوان ہندوستان کے وسیع ترین دسترخوانوں میں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا قلب اس سے بھی زیادہ وسیع تھا، بعض واقفین کا اندازہ ہے کہ پچاس مہمانوں کا روزانہ واسطہ تھا، پھر اس میں ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے لوگ ہوتے تھے، مولانا کی بشاشت، انتظام، مستعدی، اہتمام بتلاتا تھا کہ ان کو کس قدر قلبی مسرت اور روحانی لذت حاصل ہو رہی ہے۔

ضیافت اور مہمان نوازی اور اطعام وطعام ان کی روحانی غذا اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، پھر مہمانوں کے ساتھ وہ جس تواضع اور انکسار اور جس اعزاز و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے اس کو دیکھ کر قدیم عرب شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا تھا۔

وانـــی لـعـبـد الـضـيـف مـــادام نـــازلا

ومـــاشـيـمـة لـــی غـيــرهـــا مـــاتـشـبـه الـعـبـدا

(میں مہمان کا غلام ہوں، جب تک وہ میرے گھر مہمان رہے، اور زندگی کا یہی ایک موقع ہے جس میں میں غلام معلوم ہوتا ہوں)

صرف میزبانی اور مہمانی نہیں ہر موقع پر وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کا ہاتھ اونچا رہے اور استفادہ کے بجائے ان کو نفع و افادہ کا موقع ملے، اگر کسی نے ذرا سا بھی ان کے ساتھ سلوک کر دیا ہے اور کسی موقع پر کوئی خدمت انجام دی ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس فکر میں رہتے کہ اس کے ساتھ وہ کوئی سلوک کریں اور اس کے حق کو ادا کر دیں، ہم نے اہل بیت کرام کی سخاوت و شہامت و حوصلہ مندی کے جو واقعات پڑھے ہیں

ان کا پرتو مولانا کی زندگی اور ان کے بعض معاصرین کبار کے اخلاق میں پایا۔

انکار نفس اور تواضع

ہم نے جس چوتھے معیار کا ذکر کیا تھا کہ کمال و شہادت کے ساتھ اپنے نفس سے بدگمانی، اپنے نقص کا استحضار، اعلان انسانیت کی بلندی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نفس امارہ کی گرفت اور خودفریبی اور خود پرستی سے بلند ہو گیا ہے، مولانا کی زندگی میں بہت نمایاں اور یہ ان کا حال تھا قال نہ تھا۔

مولانا اپنے نام نامی کے ساتھ ہمیشہ ''ننگ اسلاف'' لکھا کرتے تھے بعض ناخداترس اخبار نویسوں نے اس کا مذاق بھی اڑایا، مگر ان کے جاننے والے اور ان کے قریب رہنے والے جانتے ہیں کہ کسی کے لیے اس طرح کے القاب و اوصاف ایک رسم اور تکلف ہوں گے، مولانا کا اپنے متعلق یہ عقیدہ تھا اور اس میں کوئی تصنع کا شائبہ نہ تھا وہ دل سے اپنے کو ''ننگ اسلاف'' سمجھتے تھے، حالانکہ اللہ نے ان کو ہر طرح سے اپنے اسلاف کرام کا جانشین اور نعم الخلف لنعم السلف کا مصداق بنایا تھا۔

اس لقب کے علاوہ وہ اکثر ایسے اشعار بڑے درد سے پڑھتے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا اپنے وجود سے بڑے شرمندہ ہیں اور اپنے کو کسی قابل نہیں سمجھتے، مجھے یاد ہے ایک مرتبہ (جب میری عمر بھی کم تھی) میں مولانا کے ہاتھ دھلا رہا تھا یا مولانا وضو فرما رہے تھے یہ شعر بڑے درد و حسرت سے پڑھ رہے تھے ؎

ذھب الذین یعاش فی أکنافھم

بقی الذین حیاتھم لاتنفع

(وہ لوگ تو چلے گئے جن کے سایہ میں زندگی گزاری جاتی تھی، وہ لوگ رہ گئے جن کی زندگی کچھ کارآمد نہیں)

اکثر وہ یہ شعر (خصوصاً جب کوئی بیعت کی درخواست کرے) پڑھتے تھے ؎

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

مولانا کے خطوط ومکاتیب سے بہت سے ایسے اقتباسات ومنقولات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے کو کیا سمجھتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو تواضع اور انکار نفس اور بے نفسی کے کس مقام رفیع پر پہنچایا تھا۔ (۱)

اخلاق وانسانیت کا خسارہ

مولانا کی وفات سے علم وسیاست کی بزم میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا افسوس کرنے والے اور اس خلاء کو محسوس کرنے والے بہت ہیں، لیکن اخلاق وانسانیت کی صف اولین اور شہ نشین میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا احساس کرنے والے شاید کم ہیں، شاید اس لیے کہ انسانیت کوئی ایسا مرتبہ نہیں سمجھا جاتا کہ کسی بزرگ یا عالم کو اس کے معیار سے جانچا جائے، اور کسی "مرد کامل" کے اٹھ جانے سے کوئی خلا محسوس کیا جائے مگر میرے نزدیک آدمیت کے اس قحط اور انسانیت واخلاق کے انحطاط عام کے اس دور میں مولانا مدنیؒ کا حادثۂ وفات ایک بڑا اخلاقی خسارہ اور انسانی حادثہ ہے۔

ع اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

(۱) میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس کا التزام کیا ہے کہ وہ صرف میرے مشاہدات اور ذاتی معلومات پر مشتمل ہو، افسوس ہے کہ یہ مضمون حالت سفر اور نقل وحرکت میں نہایت عجلت میں لکھا جارہا ہے، ورنہ اس میں بہت تفصیل کی گنجائش تھی۔

باب چہارم

اوصاف وخصوصیات، امتیازات وکمالات

مجددانہ عزیمت وبصیرت

پاکستان کے بن جانے اور ہندوستان کے حالات کے غیر یقینی ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں ڈگمگا گئے اور بڑے بڑے پہاڑ تزلزل میں آ گئے، اور پاکستان ہجرت کر جانے کا ایک ایسا وسیع اور طاقتور رجحان بلکہ نشہ سب پر چھا گیا جس کو تھامنا اور مسلمانوں کو اس ملک میں مقیم رہنے پر آمادہ کرنا مجددانہ عزیمت و بصیرت کا طالب تھا، اس کے لیے غیر متزلزل یقین، اعتماد علی اللہ اور زبردست روحانیت اور قوت ایمانی کی ضرورت تھی، یہ مسئلہ اگرچہ سارے ہندوستان کا تھا اور ضلع سہارنپور میں جمنا کے مشرقی کنارے سے لے کر دریائے ہگلی تک اسی کی لہر پھیلی ہوئی تھی، مگر سب سے بڑھ کر یہ سہارنپور کے سرحدی ضلع کا مسئلہ تھا، اور درحقیقت یہی ضلع ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن بنا ہوا تھا، اگر ضلع سہارنپور اکھڑتا اور وہاں سے مسلمانوں کا مجموعی انخلاء شروع ہو جاتا پھر ضلع مظفرنگر، میرٹھ اور ضلع بجنور کی باری تھی، جو اس سے ملحق تھے، اس کے بعد مرادآباد کا اعتبار نہ تھا، اور اس کے معنی یہ تھے کہ یوپی جو مسلمانوں کا تہذیبی اور دماغی مرکز ہے مشرقی پنجاب بن جاتا اور ہندوستان خدانخواستہ دوسرا اسپین بن کر رہتا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اور اس کی کارسازی تھی کہ اس سرحدی ضلع میں

مسلمانوں کے اندر استقلال وثبات پیدا کرنے، حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سینہ سپر ہوجانے کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے اور اکھڑے ہوئے قدموں اور ڈگمگاتے ہوئے دلوں کو جمانے کے لیے اس نے تین شخصیتیں عطا فرمائیں، جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی اس گرتی ہوئی عمارت کو تھامنے کے لیے تین ستونوں کا کام کیا، ایک حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ جو بالکل جمنا کے مشرقی کنارے اور یوپی کے آخری سرحدی لکیر پر بیٹھے ہوئے تھے اور دوسرے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سہارنپور میں تشریف رکھتے تھے، تیسرے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو دیوبند کے رکن رکین اور پورے صوبہ، ملک کے مسلمانوں کے اس وقت پشتیبان بنے ہوئے تھے۔ (۱)

مجاہدہ واستقامت

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ انگریزوں سے نفرت وعداوت، ملک کی آزادی سے غیر معمولی شغف اور عشق اور اپنے اخلاص میں بجا طور پر اپنے شیخ مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے، انہوں نے اور جمعیۃ العلماء کے دوسرے ارکان نے مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ کی (جو مسلم لیگ کا حامی تھا) ناراضگی، غصہ، اور توہین خندہ پیشانی سے برداشت کی، مولانا مدنی نے یہ سال (۱۹۴۷ء) (۲) سخت مصروفیت، انہماک، جد وجہد اور مشقت میں گذارے، انہوں نے ہزاروں میل کا سفر کیا، شہر شہر، قصبہ قصبہ گئے، اس مدت میں ان کی مذہبی اور اخلاقی زندگی بے داغ اور ہر شعبہ سے بالاتر تھی، ان کے اخلاص پر موافق ومخالف سب کا اتفاق ہے، جب ہندوستان آزاد ہوگیا اور ملک کی آزادی اور اپنی حکومت سے فائدہ اٹھانے کے زریں

---

(۱) سوانح عبدالقادر رائے پوریؒ: ۱۵۴-۱۵۵

(۲) یہ ملک ہندوستان کی تقسیم کا سال ہے، جس میں ملک کے لوگ شدید دشواریوں، مشکلات اور مصائب سے دوچار ہوئے اور نقل آبادی کے مسئلہ سخت حالات سے گزرنا پڑا تھا، ان حالات میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی ذات گرامی سب سے زیادہ تقویت کا باعث تھی۔ (ناشر)

وبہترین مواقع حاصل ہوئے تو تنہا انہیں کی ذات تھی جس نے اپنی ذات کے لیے ادنی نفع حاصل کرنا گوارہ نہیں کیا، یہاں تک کہ جب ۱۹۵۴ء میں ان کو صدر جمہوریہ ہند نے ''پدم بھوشن'' کا اعزازی خطاب دیا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ یہ ان کے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس کو قبول کرنے سے معذرت کردی، اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی آزادی سے انہوں نے جو بلند توقعات قائم کی تھیں ان میں سے بہت سی پوری نہیں ہوئیں اور ان کو اس دور میں بعض ایسے تلخ تجربے ہوئے جنہوں نے ان کا دل توڑ دیا، لیکن جنگ آزادی کی کٹھن گھڑیوں میں ان کے پایہ ثبات میں کبھی لغزش اور آزادی کے بعد کے دور میں ان کے اصول ونظریات میں کبھی تغیر نہیں آیا۔ (۱)

عفوودرگزر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ ''أن أصل من قطعني وأعفو عمن ظلمني و أعطي من حرمني '' (میں اس سے رشتہ جوڑوں جو میرا رشتہ ناطے کاٹے، اس کو معاف کروں، جو مجھ پر ظلم کرے، اس کو عطا کروں جو مجھے محروم کردے)

جو دوستی اور محبت کا معاملہ کرے اس سے اچھے تعلقات رکھنا کوئی کمال نہیں، اعلی بات تو یہ ہے کہ جو دشمنی کرے، نقصان پہنچائے اس سے حسن سلوک کیا جائے، ہمارے اسلاف اور بزرگوں کا یہی عمل تھا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ہندوستان کی تقسیم کے سخت مخالف تھے، وہ ہندوستان میں مسلمانوں کو رکھنا چاہتے تھے، پاکستان کے قیام سے انہیں اتفاق نہیں تھا، اس وجہ سے انہیں بہت تکلیف دی گئی، توہین کی گئی، بعض مرتبہ تو ان کی جان پر بن گئی، اور اللہ تعالی نے انہیں بچایا، سید پور میں لوگ ان پر پتھر پھینک رہے تھے اور مولانا مدنی آنکھیں بند کئے مراقبہ میں بیٹھے تھے، چوٹ لگ رہی تھی، اور آپ صبر وضبط کئے رہے، پھر اللہ نے ان گستاخی کرنے والوں اور ایذاء

(۱) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ: ۱۷۹

پہنچانے والوں کے ساتھ جو کیا وہ کیا، کوئی تالاب میں ڈوب کر مر گیا، کوئی پاگل ہو گیا، لیکن دیکھنے والوں نے مجھ سے بیان کیا اور خود میں نے دیکھا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب یہاں کانگریسی حکومت قائم ہو گئی تھی، جب وہ مخالفین سامنے آتے، تو بڑی خوش دلی کے ساتھ ملتے، اگر کوئی اپنے رویے کی معافی چاہتا تو فرماتے کہ کوئی بات نہیں مجھے کوئی شکایت نہیں، آپ اطمینان رکھیں، لیکن جو بات سنانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ دیکھنے والوں نے بیان کیا کہ حضرت مولانا مدنیؒ رو رو کر دعا فرماتے تھے کہ "یا اللہ! اب ان کو معاف فرما، یا اللہ! میری طرف سے ان کو معاف فرما، میری طرف سے کوئی دارو گیر نہ فرما، میری ذات سے کوئی نقصان نہ پہنچا"۔ (۱)

حق پسندی

(ترکی سے) ہندوستان واپسی کے بعد میں نے اپنی تقریروں اور گفتگوؤں میں کمال اتاترک کے بارے میں اپنے تاثرات کا بے تکلف اظہار کرنا شروع کر دیا اور وہاں کے اسلام پسند طبقہ کا عام طور پر اس کے متعلق جو خیال تھا اور اس کی "اصلاحات" سے اسلام کو ترکی میں جو نقصان پہنچا تھا اور جو معنوی روحانی و علمی نسل کشی (Genocide) عمل میں آئی تھی اس کو صاف صاف بیان کرنا شروع کر دیا، تنہا رسم الخط کے بدل جانے سے جو انقلاب عظیم برپا ہو گیا تھا جس کو فلسفی مؤرخ ٹوئن بی (Toyn Bee) نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "اب کسی ملک کا ذخیرہ کتب یا عظیم کتب خانہ کے جلانے کی ضرورت نہیں (جس سے مفت میں بدنامی ہو) کسی قوم کا رسم الخط بدل دینا کافی ہے"، میرا یہ تبصرہ اور تنقید ان حلقوں پر بڑی گراں گذری جو کمال اتاترک کو ترکی کا نجات دہندہ اور عظمت انسانی و خدمت اسلامی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر رکھتے تھے اور انہوں نے برملا مجھ سے ناگواری اور ناراضگی کا اظہار کیا۔

اس کے برخلاف واپسی کے قریب ہی زمانہ میں مولانا مدنیؒ لکھنؤ تشریف

---

(۱) تحفۂ انسانیت: ۱۹۴ (حدیث مالوہ) مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

لائے، میں نے ترکی کے سفر کے حالات وتاثرات بیان کئے، اور اتاترک کی اسلام کش پالیسی کا ذکر کیا، مولانا نے ایک لفظ بھی اس کی حمایت میں نہیں فرمایا، اور نہ چہرہ پر ادنی درجہ کی ناگواری ظاہر ہوئی، ایسا معلوم ہوا کہ ان کے قلب سلیم نے فوراً ان حقائق کو تسلیم کرلیا، اوران کا عمل "در مع الحق حیث دار" پر ہے۔

ع ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں

مجھ پر مولانا کی اس حقانیت وربانیت کا بڑا اثر ہوا کہ ان کے نزدیک معیار اسلام ہے، نہ سیاسی کامیابیاں، نہ جنگی فتوحات، نہ مغربی طاقتوں کو چیلنج کرنا یا نقصان پہنچانا۔ (۱)

خوردنوازی

یہاں پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے جو بھائی صاحب کے نام لکھا گیا تھا، بھائی صاحب نے از راہ شفقت میری حقیر دعوتی کوششوں کی اطلاع اپنے ایک خط میں مولانا کو دی تھی، تا کہ وہ خوش ہوں اور میرے حق میں دعا فرمائیں، ۱۵/ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ کا لکھا ہوا مکتوب گرامی یہاں درج کیا جاتا ہے کہ اس کو اپنے حق میں ایک بشارت اور تبرک سمجھتا ہوں۔

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک......

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، مولوی علی میاں صاحب کی خبریں روساء تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر حضرات سے معلوم ہوتی رہتی تھیں، مگر آپ کی تحریر سے تفصیلات معلوم ہوئیں، اور مزید اطمینان ہوا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاح خیر اور مغلاق شر بنائے، اور حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت عالیہ کا علم بردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے

---

(۱) کاروان زندگی: ۱/ ۴۳۶-۴۳۷، مطبوعہ مکتبہ اسلام لکھنؤ

مالا مال کرے۔ آمین.

والسلام

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

۱۵/ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ

علمی کاموں میں تعاون

بظاہر اس کی امید نہیں باقی رہی (تھی) کہ کتاب (نزهة الخواطر) کی بقیہ جلدیں جو زیادہ ضخیم تھیں شائع ہو سکیں گی، لیکن ان کی طباعت کا اس طرح غیب سے سامان ہو گیا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات کی تلاش تھی جو کہیں دستیاب نہیں ہوتے تھے، لکھنؤ کے ایک سفر میں مولانا نے اس کتاب کا مطالعہ فرمایا اس میں سے اکثر کے حالات اس کی غیر مطبوعہ جلدوں میں مل گئے، مولانا نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، اور خود مولانا ابوالکلام سے جن کی وزارت تعلیم سے دائرۃ المعارف (حیدرآباد)(۱) کا خصوصی تعلق تھا اس سلسلہ کی تکمیل کی تحریک کی، مولانا آزاد مصنف مرحوم اور کتاب سے ذاتی طور پر واقف تھے، انہوں نے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کیا، اور اس کا وعدہ فرمایا کہ وہ دائرہ کو اس کی طرف متوجہ کریں گے، چنانچہ ان کی تحریک سے بقیہ جلدوں کی طباعت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔(۲)

سرمایہ ملت اور ملی تشخص کے تحفظ کی کوشش

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کی روح کا یہی پیغام ہے، حضرت شیخ الہند اسی فکر

---

(۱) دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد مشہور اور مستند اشاعتی ادارہ ہے، جس نے نزهة الخواطر کی اشاعت کا کام شروع کیا تھا، مگر بعض حالات کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا تھا جو حضرت مدنیؒ کی کوششوں سے جاری ہوا۔ (محمود) (۲) حیات عبدالحی: ۲۹۲، سید احمد شہید اکیڈمی، دارعرفات

میں پکھلتے اور کھلتے رہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مولانا مدنیؒ (اپنے خاص طرز اور اسلوب سے) اسی کے لیے ہمیشہ سوزاں ولرزاں رہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی خصوصیات اور ملی تشخصات کے ساتھ اس ملت میں باقی رہیں، قرآن وسنت کو سینہ سے لگائے رکھیں، اختلافی مسائل چھیڑنے کے بجائے توحید وسنت پر زور دیں، دیوبند کا یہی پیغام ہے، اور یہی اس کی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے سرمایہ ملت کو بچانے کی کوشش کی۔ (۱)

ذکر

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندہلویؒ نے ارشاد فرمایا:

ع رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ رگڑ جانے کے بعد

دیکھو حنا (مہندی) کی پتی جب رگڑ دی جائے تو وہ رنگین بنا دیتی ہے، اور اگر بغیر رگڑے ہوئے اسی کے پتے رکھ دیئے جائیں تو کچھ نہ ہوگا، حضرت مدنیؒ فرماتے تھے کہ ”مسجد اجابت میں ذکر کرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ اس کی دیواروں سے سر پھوڑ دوں“۔ (۲)

رمضان کا اہتمام

ہمارے علم میں اس اخیر دور میں جس نے اسلاف کی اس سنت دیرینہ کو زندہ کیا اور اس کو نئی آب وتاب بخشی وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات بابرکات تھی، انہوں نے اپنے مخصوص طالبین ومخلصین کی درخواست پر کسی ایک جگہ قیام کر کے رمضان المبارک کے گذارنے کا معمول بنالیا، اور اطراف واکناف بلکہ ملک کے دور دراز گوشوں سے منتسبین اور ارادت مند پروانہ وار جمع ہونے لگے، حضرت نے ایک عرصہ تک سلہٹ میں رمضان المبارک گذارا، پھر کئی سال بانس کنڈی (بنگال) میں رمضان گذارا، ایک دو سال اپنے وطن مالوف الہ داد پورہ متصل

(۱) کاروان زندگی: ۳۱۰/۲ (۲) سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ: ۲۵۹

ٹانڈہ ضلع فیض آباد خاص اپنے دولت خانہ پر رمضان المبارک گذارا، ان سب مقامات پر سینکڑوں کی تعداد میں مریدین وخدام اوراس ماہ مبارک کے قدرداں جمع ہوئے جوآپ کے مہمان ہوتے، آپ ہی ان مقامات پر قرآن شریف سناتے، لوگ ذکروشغل، تلاوت وعبادت میں پوری سرگرمی وعالی ہمتی سے مشغول رہتے، خدام کو بڑی کیفیات وترقیات محسوس ہوتیں، اور وہ عرصہ تک مزے لے لے کران پرکیف وپر سرور ساعتوں کا ذکر کرتے، اگر اللہ کو منظور ہوتا اور مولانا کی زندگی وفا کرتی تو غالباً الہ داد پورہ میں یہ مبارک سلسلہ جاری رہتا، اور خدا جانے کتنے بندگان خدا اپنی مراد کو پہنچتے اور تربیت وتکمیل کے مدارج سے گذرتے، لیکن مولانا کی وفات (یوم جمعرات ۱۳/ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ-۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء) نے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا اور لوگ کف افسوس ملتے رہ گئے۔ (۱)

---

(۱) سوانح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ: ۱۲۵-۱۲۶

باب پنجم

مجاہدانہ کارنامے

الفاظ واوصاف کا درجہ حرارت

میں نے رابطہ ادب اسلامی کے ایک جلسہ میں "ادب التراجم" کے عنوان سے شخصیتوں کے تعارف، سوانح نگاری کے آداب ونفسیات اور تاریخ نویسی کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس طرح انسانی جسم، خارجی اشیاء، موسموں، مقامات اور شہروں کا درجہ حرارت و برودت (TEMPERATURE) ہوتا ہے اسی طرح الفاظ واوصاف کا بھی ایک درجہ حرارت و برودت ہوتا ہے اوران کا استعمال اسی اعتبار کے ساتھ صحیح محل ومقام اور ممدوح وموضوع کے اعتبار سے ہونا چاہیے اگر اس میں تناسب ومطابقت اور احتیاط واحساس ذمہ داری اور ادائے شہادت کے فریضہ کا احساس نہیں کیا گیا تو وہ الفاظ اپنی قدر وقیمت کھودیں گے، اور نہ صرف یہ کہ ان کی قدر وقیمت جاتی رہے گی، بلکہ جن کے لیے وہ الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت اور ان کی عظمت واہمیت کا احساس بھی نہیں ہوسکے گا، اور ایک واقف وباخبر انسان، نقاد معاصر اور غائر نظر سے مطالعہ کرنے والے کو حسرت کے ساتھ کہنا پڑے گا۔

ع اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

لیکن ایک تلخ تاریخی حقیقت، اور ادبی وتصنیفی المیہ ہے کہ ان تعارفی وتوصیفی الفاظ کا اکثر اور خاص طور پر پچھلے دور میں بڑی فیاضی اور بے احتیاطی کے ساتھ استعمال ہوا

ہے، ''ایثار و قربانی''، ''جانبازی و سرفروشی''، مجاہدانہ کارنامے''، ''مجتہدانہ فکر و نظر'' حتیٰ کہ سرآمد روزگار، نادرۂ عصر اور عبقری شخصیت (GENIUS) جیسے الفاظ کا استعمال بھی اکثر مبالغہ آرائی کے ساتھ اور ضروری احساس ذمہ داری کے بغیر ہوا ہے۔

حمیت و عزیمت کا استعمال

انہیں تعارفی و توصیفی الفاظ میں ''حمیت'' و ''عزیمت'' کے عمیق، بلند پایہ اور امتیازی اوصاف بھی ہیں، جن کی مصداق اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت، اصلاح و انقلاب اور جہد و جہاد میں ہر دور میں معدودے چند شخصیتیں ہوئی ہیں، جو کسی مخالف اسلام یا دشمن حق جبروتی طاقت کے مقابلہ پر آئیں، ''سلطان جائر'' (جو کبھی رائے عامہ، مقبول قیادت اور عوامی جوش و خروش کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے) کے منہ پر کلمہ حق کہا، کبھی کسی صاحب شوکت و سطوت سلطنت کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں، جس کا ستارۂ اقبال بلند تھا اور جس کے متعلق کبھی کبھی کہا جاتا تھا کہ ''اس کی مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا'' جنہوں نے دین کی حمیت اور حق کی حمایت میں ہمیشہ ''رخصت'' پر ''عزیمت'' کو اور سکون و اطمینان کی زندگی اور اعزاز و افتخار کے مناصب و مواقع پر قید و بند اور طوق و سلاسل کو ترجیح دی، اور جن کی اسلام کی بے کسی، مسلمانوں کی بے بسی، شعائر اسلامی کی اہانت، آزاد و باعظمت اسلامی سلطنتوں اور ملکوں کی پامالی پر راتوں کی نیند حرام اور دن کا سکون غائب ہو گیا اور جن کی زبان حال کہتی تھی ؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے، اک درد سا دل میں ہوتا ہے

ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں، جب سارا عالم سوتا ہے

لیکن ان الفاظ ''حمیت'' و ''عزیمت'' کا استعمال بھی ہمارے پچھلے دور کے سوانحی لٹریچر اور سیاسی و دینی جلسوں کے اسٹیج پر ہونے والی تقریروں میں ایسی فراخ دلی اور اس کثرت کے ساتھ ہوا کہ ان الفاظ میں بھی کوئی جاذبیت اور وزن نہیں رہا، چنانچہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے پہلے ''مکتوبات شیخ الاسلام'' مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی کے حصہ دوم (شائع شدہ ۱۹۵۴ء) کا مقدمہ لکھتے ہوئے پہلی بار لکھا تھا کہ:

> ''ایک جامع فضائل ہستی کے بارے میں یہ اندازہ لگانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فضائل وکمالات میں مرکزی و نمایاں صفت کون سی ہے جس کو اس کی شخصیت کی کلید قرار دیا جائے، اور جس سے اس کی زندگی وخصوصیات کو سمجھنا آسان ہوجائے؟ مولانا کو بہت سے لوگ ایک عالم اور محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک سیاسی رہنما اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو ان سب فضائل سے آراستہ کیا ہے، لیکن میری کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، جنہوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے، ایک ''عزیمت'' دوسرے ''حمیت''۔ (۱)

پھر ۱۹۸۰ء میں اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' کے حصہ اول میں (اس مضمون میں جس میں مولانا کے بارے میں اپنے دید وشنید اور مشاہدات وتاثرات کا ذکر کیا ہے) اسی مضمون کو مختصراً دہرایا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ان اوصاف، حمیت و عزیمت، یا عزیمت وحمیت کا عرصہ سے ایسا موقع بے موقع استعمال کیا گیا تھا اور گوش ونظر ان کے صحیح وزن اور ان کے درجہ حرارت اور ان کے اس سلسلہ میں اقبال کے الفاظ میں ''دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز'' پھر ان کے ہدف ونشانہ کی بلندی اور ان کے میدان کی وسعت اور اس میدان کی دشوار گزاری اور خارزاری سے اتنے ناآشنا

(۱) مقدمہ ''مکتوبات اسلام: ۱۱

تھے کہ لکھنے والے کا یہ احساس غالباً خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ مولانا کے عقیدت مندوں کے وسیع حلقہ میں ان مضامین کے پڑھنے والوں میں سے ایک تعداد نے اس کو مولانا کی بلند پایہ ذات کے ساتھ ناانصافی شمار کیا، اور اس مضمون نگار کی (جس کو خواہ مخواہ اس مجموعہ مکاتیب پر مقدمہ لکھنے کی زحمت دی گئی) نظر نارسائی اور قلم کی کوتاہ بیانی پر محمول کیا، لیکن مجھے اس حقیقت کے اظہار میں اب بھی کوئی تردد یا اس اظہار خیال پر ندامت و شرم ساری کا کوئی احساس نہیں ہے، اور میں اب بھی ان دونوں امتیازی صفات کو مولانا کی کثیر الجہات اور عظیم الصفات والکمالات ذات میں مرکزی مقام اور ان کو ان کی انفرادیت سمجھنے کے لیے "شاہ کلید" کا درجہ دیتا ہوں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ جس جبروتی طاقت اور عظیم سلطنت کے مقابلہ میں وہ میدان میں آئے، اس کا (جہاں تک اسلام اور مسلمانوں، خلافت اسلامی اور آزاد ممالک اسلامیہ اور خود ہندوستان کا تعلق ہے) تاریخی کردار، اس کی اسلام دشمنی، اسلامی سطوت ووحدت کی بیخ کنی، اور خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ کے زوال واستیصال میں اس کا قائدانہ حصہ، جزیرۃ العرب، حجاز مقدس اور ان عرب ممالک پر اثر ونفوذ قائم کرنے کی کامیاب جدوجہد جو دعوت اسلامی کا منبع وسرچشمہ، مقامات مقدسہ پر مشتمل اور مسلمانوں کی عقیدت ومحبت کا مرکز ہیں، نیز اس عظیم مردم خیز، تاریخ ساز تجدیدی واصلاحی تحریکوں اور علوم دینیہ واسلامیہ کے آخری مرکز ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ اور وہاں کی اس مسلم آبادی پر جس نے اس ملک پر آٹھ سو برس تک بڑی شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی تمدنی وتہذیبی، علمی وفکری، سیاسی وانتظامی طور پر اس کو چار چاند لگائے اور اس کو پہلی مرتبہ سیاسی وحدت ومرکزیت اور انسانی وحدت ومساوات اور سماجی عدل وانصاف سے آشنا کیا، ان سفاکانہ مظالم کی داستان بھی سامنے ہو جن کا اعتراف انگریز مصنفین ومورخین اور عسکری وانتظامی شعبے کے ذمہ داروں نے بھی کیا ہے، اور جن کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں...... تاریخی عہد کے تقدم و

تاخر کے لحاظ سے پہلے یہ داستان ہندوستان ہی کی کہانی سے شروع کرتے ہیں، جو انیسویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے، اس کے بعد خلافت اسلامی سلطنت عثمانیہ اور بلاد عربیہ کے سلسلہ میں اس کے مجرمانہ سیاسی کردار کا ذکر کریں گے۔

جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جس کو انگریز مصنفین کی تقلید میں ۱۸۵۷ء کا غدر کہا جاتا رہا ہے) صحیح معنی میں عوامی اور قومی جدوجہد تھی اور ہندو مسلمان سب اس میں شریک تھے، ہندوستان نے وطن پرستی، اتحاد و گرم جوشی اور جوش و ولولہ کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا، پھر یہ واقعہ ہے کہ قیادت اور رہنمائی کے میدان میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا، اس کے اکثر قائد مسلمان ہی تھے، اور جیسا کہ سر ولیم ہنٹر نے لکھا ہے:

> ''اس جنگ میں وہی چنگاریاں کام کر رہی تھیں جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور مجاہدین نے فروزاں کی تھیں''۔ (۱)

جنگ آزادی کی یہ کوشش جب ناکام ہوئی تو انگریزوں نے ہندوستانیوں سے سخت انتقام لیا، جس کی داستان لرزہ خیز اور ہوش ربا ہے، یہ ایک قتل عام اور نسل کشی تھی لیکن مسلمان خاص طور سے اس کا نشانہ تھے، اس لیے کہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلامی جہاد تھا اور مسلمان اس بغاوت کے بانی، قائد اور رہنما ہیں۔

ایک انگریز مصنف (HENRY MEAD) کہتا ہے:

> ''اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جاسکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' کا ایک باب ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ'': ۱۵۴-۱۸۰

ہوگئی یعنی یہ کہ یہ اسلامی بغاوت تھی"۔ (۱)

ایک معاصر مؤرخ لکھتا ہے:

"ایک انگریز کا شیوہ یہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان؟ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا"۔ (۲)

پھر پھانسی کا سلسلہ شروع ہوا، عام شاہراہوں، سڑکوں پر پھانسی کے تختے لگا دیئے گئے، اور یہ جگہیں انگریزوں کی تفریح اور دلچسپی کا مرکز بن گئیں، جہاں آ کر وہ پھانسی پانے والوں کے سسکنے اور دم توڑنے کے وقت کا لطف لیتے، سگریٹ کا کش لگاتے اور آپس میں باتیں کرتے رہتے، جب پھانسی کا کام پورا ہو جاتا اور وہ مظلوم شخص آخری سانس لیتا تو ہنسی اور مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتے، ان بدنصیبوں میں بڑے بڑے ذی وجاہت اور اشراف تھے، بعض مسلم محلے اس طرح تہہ تیغ کر دیئے گئے کہ ایک فرد بھی باقی نہ بچا۔

ایک معاصر مؤرخ لکھتا ہے:

"ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا، اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے"۔ (۳)

میل سن لکھتا ہے:

"ہمارے فوجی افسر ہر قسم کے مجرموں کو مارتے پھرتے تھے اور کسی درد و تاسف کے بغیر انہیں پھانسیاں دے رہے تھے، گویا وہ کتے تھے یا گیدڑ، یا

Loard Roberts, Forty One Years In India P'152(۱)

(۲) ۱۸۵۷ء از غلام رسول مہر

(۳) قیصر التواریخ جلد دوم، از: سید کمال الدین حیدر، ص: ۴۵۴

نہایت ادنیٰ قسم کے کیڑے مکوڑے"۔ (۱)

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس نے ۲۱/ جون ۱۸۵۷ء کو اپنی والدہ کو ایک خط میں لکھا:

"سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑا دیا جائے، یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے، لیکن موجودہ وقت ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے، ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے"۔ (۲)

ان سفاکانہ مظالم اور قتل عام کے بعد دوسرا قدم یہ تھا کہ مسلمانوں پر معاش کے دروازے بند کئے جائیں، ان کے اوقاف اور جائدادوں کو ضبط کیا جائے، جن سے ان کے مدارس اور ادارے چلتے ہیں، ایسے مدارس کھولے جائیں اور ایسا تعلیمی نظام قائم کیا جائے جس سے مسلمان فائدہ نہ اٹھا سکیں، اسی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی متعدد جلیل القدر ہستیوں کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دے کر انڈمان روانہ کر دیا گیا، (۳) جن میں سے کئی حضرات نے وہیں وفات پائی۔

یہ حالات وحقائق تھے جنہوں نے اہل حمیت مسلمانوں اور خاص طور پر ان علمائے ربانی اور اساطین ایمانی کے (خالص دینی حمیت، انسانی غیرت اور حب الوطنی کے جذبہ سے) دلوں کو زخمی کر دیا، ان میں سرفہرست حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت قدسیہ کے باقی ماندہ افراد، مسلک ولی اللّٰہی کے حامل، اور وہ عالی نظر علماء تھے جو انگریزی حکومت اور اقتدار کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا حریف، مادی ولادینی تحریک کا علم بردار، پورے مشرق وایشیا کی عزت کو خاک میں ملانے والا، اور

---

(۱) میلی سن، جلد دوم: ۱۷۷

(۲) Edward Thompson, The Other Side Of the Medeal. P.40 (1926)

(۳) مثلاً: مولانا یحییٰ علی صاحب صادق پوری، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی وغیرہ

دنیا کی تہذیب و سیاست کو ایسا رخ دینے والا سمجھتے تھے جس میں روحانیات و اخلاقیات بلکہ انسانی قدروں کے بھی پنپنے اور باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور اس کی قیادت کی، ہندوستان کے اس حصہ کو ہم اسی جگہ چھوڑتے ہوئے اب خلافت اسلامیہ، سلطنت عثمانیہ اور بلاد عربیہ کی طرف آتے ہیں۔

خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ

مغربی طاقتوں نے خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ کو ہمیشہ اس نظر سے دیکھا کہ وہ ایک طرف اسلام کی پاسبان، مسلمانوں کی عزت وعظمت کا نشان، حجاز مقدس، جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کی امین اور ان کی حفاظت کا حصار اور مسلمانوں کی سیاسی طاقت، وحدت، خود اعتمادی و خودشناسی کی ضامن ومحافظ ہے، دوسری طرف وہ یورپ کے سینہ پر ایک کیل ہے جس نے اس کو صدیوں سے بے چین کر رکھا ہے اس احساس میں برطانیہ جس نے چھٹی صدی ہجری میں اور بارہویں صدی عیسوی میں جنگ صلیبی میں بھی قائدانہ کردار ادا کیا تھا اور ''شیر دل'' رچرڈ نے اس کی نمائندگی کی تھی پیش پیش تھا، اسی کی تحریک اور اشارہ سے بلقان کی جنگ کا طویل سلسلہ شروع ہوا، جس کا مقصد یورپ میں ترکی مقبوضات اور مستعمرات کو آزاد کرانا اور ترکی سلطنت کو کمزور اور محدود سے محدود تر کر دینا تھا، اسی سلسلہ کا ایک اہم حصہ شریف مکہ (شریف حسین) کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا اور ان کو خلافت کے منصب پر فائز کرنے کا وعدہ تھا، ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو برطانیہ کے نمائندے اور مصر کے امور کے ذمہ دار لارڈ کچز نے شریف حسین کو ان کے صاحبزادہ شاہ عبداللہ اور دوسرے بااثر لوگوں کے ذریعہ اتحادیوں کا ساتھ دینے اور خلیفہ عثمانی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کر لیا، اور ان کو منصب خلافت پر فائز ہونے اور حجاز کا مطلق العنان حاکم بننے کے سبز

باغ دکھا کر اور مؤکد وعدوں اور تحریری دستاویزوں کے ذریعہ اس اقدام پر آمادہ کر لیا، جو مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں عرصہ دراز تک ایک بدنما داغ اور ایک شرمناک واقعہ کے طور پر ذکر کیا جاتا رہے گا، ۳۰/ اگست ۱۹۱۵ء سے ۱۸/ فروری ۱۹۱۶ء تک حکومت برطانیہ کے مؤقر نمائندوں اور شریف مکہ کے درمیان خطوط اور رسائل کا تبادلہ ہوتا رہا، اور ان کو یقین دلایا جاتا رہا کہ ان کو اس اقدام کا پورا صلہ اور انعام ملے گا، لیکن جنگ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۱۸ء میں جب روز روشن کی طرح یہ حقیقت سامنے آگئی کہ یہ سب وعدے سیاسی فریب اور نقش برآب تھے، ان کے بلند حوصلہ صاحبزادہ فیصل بن حسین کو شام سے جسے انہوں نے سابقہ وعدوں کی بناء پر اپنے قبضہ میں لے لیا تھا، بیک بینی و دو گوش نکلنا پڑا، اور فرانس نے اس ملک کا چارج لیا، اسی طرح لبنان پر فرانس نے اور فلسطین و بیت المقدس پر پھر برطانیہ نے اپنا اقتدار قائم کیا تو ان سب معاہدات کی قلعی کھل گئی، جو برطانیہ اور شریف حسین کے درمیان ہوئے تھے۔

اس زمانہ میں جب عرب پورے اخلاص کے ساتھ خلافت عثمانی کے بالمقابل اتحادیوں کے حلیف بن کر ترکوں سے لڑ رہے تھے، روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا، ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی، اس وقت وہ تمام خفیہ معاہدے منظر عام پر آگئے جو قیصر کی حکومت کے زمانہ میں ہوئے تھے یا جس میں وہ ایک فریق تھے، انہیں معاہدات اور دستاویزوں میں سائیکس بیکو کا وہ معاہدہ تھا جو برطانیہ اور فرانس کے درمیان ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا، جس میں فریقین نے جنگ میں فتح حاصل کرنے بعد مشرق وسطی میں سلطنت عثمانیہ کو مردہ آدمی کے ترکہ کی طرح تقسیم کیا تھا اور اس کے حصے بخرے کر دیئے تھے، شریف حسین کو ترکوں کے واسطہ سے جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے سر میکموہن سے اس کی حقیقت معلوم کی، انگریزوں نے اس وقت بھی یہی کہا کہ وہ اپنے قدیم وعدوں پر قائم ہیں اور وہ عربوں کی آزادی اور عربی وحدت کے اعلان کا بھی عزم کر چکے ہیں، لیکن جلد ہی اس فریب کا پردہ چاک ہوگیا، اور ۳۰/ اکتوبر ۱۹۱۸ء

کو برطانیہ اور فرانس نے سائیکیس بیکو کے معاہدہ ہی کے مطابق شام و فلسطین و عراق کو تقسیم کرلیا، جس میں شام، صوبہ بیروت، جبل لبنان و کیلیکیا شام کے حصہ میں فلسطین و عراق انگریزوں کے حصہ میں آئے، اور شریف حسین کو حجاز چھوڑ کر اپنے صاحبزادہ شاہ عبداللہ کے پاس عمان پھر قبرص میں پناہ لینی پڑی، جہاں انہوں نے غریب الوطنی اور کس مپرسی کی حالت میں ۱۹۳۱ء میں جان دی، عرب فاضل محمد جمیل بیہم اپنے فاضلانہ مقالہ "انتقاضات العرب القومية" شائع شدہ "مجلة اللغة العربية" دمشق (ستمبر ۱۹۷۰ء) میں لکھتے ہیں:

"میں شریف حسین سے قبرص میں جو ان کی جلاوطنی کی جگہ تھی، جب ۱۹۲۹ء میں ملا تو روئی کے ایک تھیلہ میں بندھے ہوئے ان معاہدات کو انہوں نے مجھے دکھایا جب میں نے ان سے ان کی یادداشتوں کے ایک سلسلہ میں ترتیب دینے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا: أتركها على بركات الله"۔ (۱)

راقم سطور جب ۱۹۵۱ء میں بیت المقدس حاضر ہوا تو مسجد اقصی کی ایک حاضری کے موقع پر ایک معمر بزرگ سے ملاقات ہوئی، جو مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کے رفیق اور معتمد رہ چکے تھے، انہوں نے کہا کہ میں ایک مرتبہ مفتی صاحب کی ہمرکابی میں شریف حسین کی عیادت کے لیے عمان گیا، ہمیں دیکھ کر شریف مکہ نے کہا کہ مجھے بٹھا دو، انہوں نے شاہ عبداللہ کو خطاب کر کے کہا:

"یا عبد اللّٰہ! اعتبر، اذکر، اتعظ"

(عبداللہ! عبرت حاصل کرو، ہوش کی آنکھیں کھولو، سبق لو، یہ انگریز کسی کے نہیں ہیں)

شاہ عبداللہ نے کہا کہ آرام فرمائیے، آرام فرمائیے، اور ان کو لٹا دیا۔

---

(۱) مجلہ: ۶۸۷

انقلاب انگیز تبدیلیاں

ترکی کے حصے بخرے کرنے اور بلادعربیہ اور جزیرۃ العرب پر اپنا سیاسی اثر ونفوذ قائم کرنے سے زیادہ خطرناک وہ دوررس، انقلاب انگیز اور منحوس فیصلے اور تبدیلیاں تھیں جو برطانیہ نے ترکی کی نئی قائم ہونے والی سلطنت سے (جس کی قیادت مصطفیٰ کمال پاشا کررہے تھے) کرائیں، اور جنہوں نے ترکی کو خلافت اسلامی کا امین و محافظ، ایک پرجوش، جاں نثار، حامی اسلام، سربکف مجاہد اور جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا متولی بننے کے بجائے ایک لادینی، آزاد، مغربی طرز کی سیکولر سلطنت بننے میں تبدیل کردیا، مارچ ۱۹۲۴ء کی تاریخ تھی جب قسطنطنیہ کی مجلس وطنی نے الغاء خلافت کا فیصلہ کیا، یہ فیصلہ مغربی طاقتوں، بالخصوص برطانیہ کے اشارہ بلکہ اصرار سے عمل میں آیا، "تاريخ الدولة العثمانية" کا فاضل مصنف ڈاکٹر علی حسون لکھتا ہے:

> "انگلستان نے اس اعلان کے فوراً بعد ترکی کو بحیثیت ایک آزاد سلطنت کے تسلیم کیا اور اس کی فوجیں ترکی کے حدود سے باہر نکل آئیں، برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے مجلس عوام میں اس کارروائی پر احتجاج کیا، اس کا جواب کرزن نے ان الفاظ میں دیا کہ:
>
> "مسئلہ یہ ہے کہ ترکی کا ایسا زوال عمل میں آگیا ہے کہ اس کے بعد پھر اس کا عروج نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہم نے اس کی روحانی ومعنوی طاقت (خلافت اسلامی) کو ختم کردیا ہے"۔ (۱)

اس کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ لوزان کانفرنس میں برطانوی وفد کے صدر کرزن نے ترکی کو تسلیم کرنے کے لیے چار شرطیں رکھی تھیں، ۱- خلافت اسلامیہ کا مکمل خاتمہ، ۲- خلیفۃ المسلمین کی جلاوطنی، ۳- ان کے مال وجائداد کی ضبطی

(۱) تاريخ الدولة العثمانية، ص: ۲۷۳، مطبوعہ مکتبہ اسلامی، دمشق بیروت

۴۔حکومت کے لادینی (سیکولر) ہونے کا اعلان، جس کو اگرچہ ترکی وفد نے اس وقت منظور نہیں کیا، لیکن کمال اتاترک کی کوششوں سے بالآخر پارلیمنٹ نے اس کو منظور کیا اور مغربی طاقتوں کا جس میں برطانیہ پیش پیش تھا وہ خواب پورا ہوا جو عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔

تاریخی المیہ

یہ وہ تاریخی سانحہ اور المیہ تھا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اور ان میں سب سے زیادہ علماء کے طبقہ کو اور ان میں بھی اس جماعت کو جس کے دل میں حمیت اسلامی کا دریا جوش مار رہا تھا اور جس کو اپنے اسلاف سے عزیمت و جہاد، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی دولت ورثہ میں ملی تھی، بے چین اور مضطرب بنادیا اور مغربی طاقتوں بالخصوص برطانیہ کے خلاف ایک ایسی نفرت، بیزاری پیدا کردی جس کی نظیر برطانیہ کے دوسرے مقبوضہ ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی، ان کی اس حمیت اسلامی نے تحریک خلافت کی شکل میں وہ عظیم تحریک پیدا کی جس کی دوسرے اسلامی ملکوں میں نظیر نہیں ملتی، طبقہ علماء میں اس کے نمایاں ترین قائد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا قیام الدین عبدالباری لکھنوی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی وغیرہ، اور طبقہ علماء کے باہر رئیس الاحرار مولانا محمد علی، مولانا محمد شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، حاذق الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ تھے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کو جن میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولوی عزیز گل صاحب، حکیم مولوی نصرت حسین صاحب تھے،

حجازی حکام نے گرفتار کر کے انگریزی حکومت کے حوالہ کر دیا جس نے انہیں پہلے مصر پھر مالٹا میں اسیر ونظر بند رکھا، یہ حضرات وہاں تین سال دو ماہ رہ کر فروری ۱۹۲۰ء میں رہا ہو کے جون ۱۹۲۰ء میں ہندوستان آئے، لیکن حکیم نصرت حسین صاحب کوڑوی کا وہیں انتقال ہوا۔ (۱)

تحریک خلافت کا مظہر اتم

تحریک خلافت نے ہندوستان میں جو جوش ایمانی، غیرت اسلامی، حمیت دینی، بلند نگاہی، اور مصائب ومحن پر صبر واستقامت کی شان پیدا کر دی تھی، اس کو "حمیت" و "عزیمت" کے الفاظ سے بہتر الفاظ (بشرطیکہ ان کے صحیح وزن اور درجہ حرارت کو سمجھا جائے) نہیں مل سکتے، اور اس کا مظہر اتم اور نمونہ کامل حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے، جن کی انگریز دشمنی اور حمیت دینی فکری واعتقادی حدود سے آگے بڑھ کر قلبی و جذباتی نفرت وعداوت اور قال سے آگے بڑھ کر حال میں تبدیل ہوگئی، (۲) اس موقع پر مولانا کے ایک مکتوب کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس سے ان کی دینی حمیت، انگریز دشمنی اور حب الوطنی کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے اور اس کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے، اس کی مزید تفصیل اور شرح وبسط "نقش حیات" میں ملے گا:

> "میرے محترم دوست! آپ کو معلوم ہے کہ اگرچہ تمام غیر اسلامی مذاہب اور ان کے ماننے والے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، مگر سب دشمن ایک طرح کے نہیں ہوتے، کوئی بڑا ہے

---

(۱) اس وقت ان کی عمر ۲۹/ سال تھی۔

(۲) اس کا کسی قدر اندازہ مولانا کی مجلس میں بیٹھنے والوں، اور فجر کی نماز میں قنوت نازلہ سننے والوں کو ہو سکتا تھا کہ جب مولانا دشمنان اسلام کے لیے "اللهم دمر ديارهم ونكس أعلامهم وزلزل أقدامهم وفل حدهم واهزم جندهم، أللهم خذهم أخذ عزيز مقتدر" کے الفاظ ادا کرتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں اس کے اثر سے شگاف پڑ جائیں گے۔

کوئی چھوٹا ہے، ہر دشمن سے اس کے درجہ کے موافق مقابلہ کرنا لازم ہوگا، جب سے اسلام نے ظہور کیا ہے انگریز کے برابر اسلام اور مسلمانوں کو کسی قوم نے نہیں نقصان نہیں پہنچایا، انگریز دو سو برس سے زیادہ عرصہ سے اسلام کو فنا کر رہا ہے اس نے ہندوستان کی اسلامی طاقت کو فنا کیا، بادشاہوں اور نوابوں اور امراء کو قتل کیا، ان کی فوجوں کو برباد کیا، حکومتہائے اسلامیہ کو تہہ و بالا کیا، خزانوں کو لوٹا، اپنے اقتدار کا خزانہ قائم کیا، اپنے قوانین کو جاری کیا، ہندوستان کی تجارت، صنعت و حرفت، علم و تہذیب وغیرہ کو برباد کیا، ٹیکسوں اور لگانوں وغیرہ کے ذریعہ سے ہر قسم کی مالی لوٹ جاری کر کے اپنے ملک کو غنی اور ہندوستان کو کنگال بنایا، ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو انتہائی ذلیل، نادار، بے کار، بے روزگار بنایا، مسلمانوں سے ہندوستان کے دوسرے مذہبوں والوں کو متنفر کر کے دشمنی کی آگ بھڑکائی، اور ہر جگہ بے ہتھیار اور کمزور کیا، ہندوستان میں اسلامی قوانین کے خلاف شراب اور فحشیات کی آزادی، زنا اور بدکاری کی آزادی، الحاد و زندقہ و ارتداد کی آزادی، عدالتوں میں خلاف اسلام قانون کا اجراء اور وہاں کے موافق فیصلہ جات جاری کیے، محکمہ قضاء کے خلاف معاہدہ مٹا کر مسلمانوں کے اسپیشل قوانین کو ملیا میٹ کیا وغیرہ وغیرہ، ہندوؤں کو قصداً بڑھا کر ہر محکمہ اور ہر شعبہ زندگی میں قوی تر کیا، اور سود در سود کو جاری کیا، غرض کہ ہر طرح سے اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان میں برباد کیا، اور جب کہ مسلمانوں نے اپنے فطری اور شرعی حق آزادی کے لیے جدوجہد

کی تو ان پر اس قدر مظالم کیئے کہ ان کی یاد سے بھی دل تھرا آتا ہے، ۱۸۵۷ء کی تاریخ اور ان سے پہلے کے واقعات دیکھیے، معاہدات اور وعدے جو ۵۷ء سے پہلے کیے تھے اور ۵۷ء میں ہوئے، ان کو بار بار توڑتے رہے، غرض کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خصوصا اور تمام ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ عموماً وہ شرمناک معاملے کیئے کہ وہ ہندوستان جو کبھی جنت نشاں تھا جہنم نشاں بن گیا، وہ ہندستان جو کہ دولت وثروت کا مرکز تھا وہ فقر و فاقہ، افلاس وتنگ دستی کا اڈہ ہوگیا، وہ ہندوستان جو کہ علم وحکمت کا سمندر تھا وہ جہالت اور بد دینی کا چٹیل میدان ہوگیا، وہ ہندوستان جو تمام دنیا کا محتاج الیہ تھا وہ سب سے زیادہ مفلس، قلاش، مسکین، فاقہ مست، بے کمال، بے روزگار، گرانی اور پس ماندگی کا شکار ہوگیا، یہ مظالم تو تھے ہی جن میں مسلمان سب سے زیادہ تباہ ہوئے''۔(۱)

برطانیہ کی سرپرستی

برطانیہ کی اسلام دشمنی کا دوسرا اور ممالک عربیہ اور مقامات مقدسہ کو (جن کی وحدت اور آزادی کے وعدہ پر شریف حسین کو خلیفۃ المسلمین اور سلطنت عثمانیہ کے خلاف آمادہ کیا تھا) ہمیشہ کے لیے داؤں پر لگا دینے کا منحوس اقدام، فلسطین میں اسرائیل کی آزاد حکومت کا قیام ہے، جو ۱۹۴۸ء میں خالص برطانیہ کی سرپرستی میں عمل میں آیا اور جو عالم عربی کے جسم میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے اور جس نے پورے فلسطین ضفہ غربیہ اور سینا اور لبنان کو یہودیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اسلام دشمنی اور عربوں کے مفاد کے خلاف اس پچھلے عہد میں کسی مغربی طاقت

(۱) مکتوبات شیخ الاسلام، حصہ دوم: ۸۱-۸۲-۸۴، مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی

کی طرف سے کوئی منصوبہ یا اقدام وجود میں نہیں آیا۔

اظہارِ حقیقت

اس مضمون کے آخر میں اس تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک پر سات سمندر پار کی ایک بدیسی قوم کا جس کی تہذیب، کلچر، زبان، مذہب اور سیاسی مقاصد سے کوئی میل نہیں کھاتے تھے، حکومت کرنا ایک غیر فطری، غیر عقلی اور غیر اخلاقی صورت حال تھی، جس میں زیادہ دنوں تک باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی، کسی نہ کسی ملک کی روح اور ضمیر کا اس کے خلاف بغاوت کرنا اور اس کی حکومت کے جوئے کو اتار کر پھینک دینا اور ملک کا آزاد ہو جانا ایک فطری عمل تھا اور زمانہ قریب و بعید میں اس ملک کا آزاد ہونا تقدیر الٰہی اور اقوام و ملل کی تاریخ کا پرانا تجربہ اور بار بار پیش آنے والا واقعہ تھا، اس لیے اس جنگ آزادی میں جو اس ملک کے محبان وطن اور باعزت اور باضمیر انسانوں نے انیسویں صدی کے آخر ہی میں شروع کردی تھی، مسلمانوں کا قائدانہ حصہ لینا، اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ طبقہ علماء کا پیش پیش ہونا، نہ صرف حب الوطنی کا تقاضا اور اس ملک کا (جس میں انہوں نے صدیوں تک امن و امان اور سکون و اطمینان کے ساتھ آزاد مذہبی زندگی گزاری تھی اور دین و علوم دینیہ کی خدمت کی تھی) اخلاقی و دینی فرض تھا، بلکہ دینی بصیرت، بالغ نظری، حقیقت پسندی، اور انجام بینی کا بھی تقاضا تھا، اس لیے کہ جس ملک کو اجنبی طاقت سے آزاد کرانے میں اہل دین کا قائدانہ حصہ نہیں ہوتا، اس ملک کے آزاد ہونے کے بعد ان کو اس ملک میں اپنے ملی تشخص کے بقا اور اس سرزمین پر عزت و اعتماد کے ساتھ رہنے کا مطالبہ کرنے اور اس کے لیے جد و جہد کرنے کا موقع نہیں رہتا، اور وہ اس ملک کی جدید تعمیر و تشکیل میں آزادانہ و مساویانہ حصہ لینے کے مدعی اور طلبگار نہیں بن سکتے، کہ الغنم بالغرم (نقصان اٹھانے کے بقدر فائدہ حاصل کرنے کا استحقاق ہوتا ہے) کا اصول ہر زمانہ میں تسلیم کیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا مدنی، ان کی جماعت (جمعیۃ العلماء) ان کے رفقائے کار، اور جنگ آزادی میں حصہ لینے والے اور اس کے سلسلہ میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانے والے مخالفین کی ناراضگی اور مقاطعہ کا نشانہ بننے والے علماء اور اہل دین کا (جن کے سرخیل اور پیشوا شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ تھے) ملت اسلامیہ ہندیہ پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی قربانیوں، خلوص و بے غرضی، ہمت و عزیمت اور صبر و استقامت سے (جو اکثریت کے بڑے سے بڑے قائدین کی قربانیوں سے کم نہیں) ہندوستان کی ملت اسلامی کو اس قابل بنادیا کہ وہ اس سرزمین پر اعزاز و افتخار کے ساتھ سر اونچا کر کے چلے، بڑی سے بڑی سیاسی اور مدعی ایثار و قربانی جماعت سے آنکھیں ملا کر بات کرے، اور اپنے دین و شریعت، اپنی زبان و تہذیب، اپنے عائلی قانون اور ملک کی آئین سازی اور نظام تعلیم میں اپنے تشخص اور ملی ضروریات کے تحفظ کا (احساس کہتری کے ادنی شائبہ کے بغیر) مطالبہ کرے اور اس کے لیے جدوجہد کو جائز ہی نہیں ضروری سمجھے، یہ ملت پر اتنا بڑا احسان ہے جس سے وہ کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتی، اور تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی، ان دینی قائدین اور مجاہدین آزادی کو ببانگ دہل یہ اعلان کرنے کا حق ہے کہ

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

امت اسلامیہ دوراہے پر

ہندوستان کی ملت اسلامی ملک کے آزاد ہونے کے ۳۰-۴۰ سال بعد پھر ایک ایسے دوراہے پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ایک راستہ ملت کے اپنے دینی، تہذیبی، لسانی و ثقافتی تشخص کے ساتھ باقی رہنے کی طرف جاتا ہے، دوسرا راستہ اپنے ہر قسم کے ملی، دینی و تہذیبی تشخص سے محرومی اور تعلیمی پالیسی، لسانی فارمولے، ذرائع ابلاغ، یکساں سول کوڈ (Uniform Civil Code) اور جارحانہ احیائیت (Aggressive Revivalism) معنوی نسل کشی (Cultural Genocide) کی طرف

لے جاتا ہے، اس موقع پر پھر ایسے رہنما یا رہنماؤں کی ضرورت ہے جو حضرت مدنیؒ کی حمیت و عزیمت کے ساتھ میدان میں آئیں، اور اس ملت کو عرصہ تک کے لیے ان خطرات سے محفوظ کریں۔

آخر میں اس مقالہ کو خود حضرت مدنیؒ کے ایک پسندیدہ شعر پر ختم کرتا ہوں جس کو انہوں نے اپنا اصول زندگی بنالیا تھا اور جس کا مفاد یہ ہے کہ وہ "شاہ خوباں" (خدائے بالا و برتر) اپنی رضا و مقبولیت اور خلق خدا میں اعتماد و قبولیت کا جام "سر کشیدہ" کے بجائے "سر بریدہ" کو اور "خود بینی و خود پرستی" کے بجائے "ایثار و قربانی" کو اپنا شعار بنانے والے کو اور ان کو عطا فرماتا ہے جو "فنا" کے راستہ سے "بقا" تک پہنچتے ہیں۔

یہ شعر مولانا نے اپنے ایک مخلص خادم کو لکھا تھا اور وہ خط ہمارے خاندانی مرقعہ خطوط میں محفوظ ہے۔

نمی دانی کہ آں شاہ نکو نام
بدست سر بریدہ می دہد جام[1]

(۱) یہ مقالہ دہلی میں منعقد "شیخ الاسلام سیمینار" کے لیے لکھا گیا تھا، جس کا مجموعہ اسی خاندان والا شان کے ایک فرد رشید ڈاکٹر رشید الوحیدی صاحب نے مرتب کر کے "الجمعیۃ بک ڈپو" گلی قاسم جان، دہلی سے شائع کیا، یہ سیمینار ۱۸-۱۹/ مارچ ۱۹۸۸ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ (محمود)

باب ششم

عظیم قائد اور عظیم مرشد و مربی

سب سے نایاب اور مشکل کام

مجھے اپنی اس زندگی میں جس چیز کا بار بار تجربہ اور مشاہدہ ہوا ہے یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نایاب اور مشکل کام انسان کا بروقت پہچاننا ہے، ہر شخص اپنے اپنے تخیل اور تجربہ کے مطابق اپنے زمانہ کے مشاہیر کا ایک نقشہ اور ایک خیالی تصویر تیار کر لیتا ہے اور اس کو مقام دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک عارف کو کہنا پڑا ہے ۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جست اسرار من

لیکن بعض صورتوں میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب اس پر کچھ اس طرح کے حجابات پڑ جاتے ہیں جو عام لوگوں میں معروف ہوں اور جو رواجی ہوں، جن کا اپنا ایک خاص ڈھانچہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں انسان کا پہچاننا اور مشکل ہو جاتا ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص اہل دنیا کے لباس میں رہتا ہے تو اندر سے وہ خواہ کچھ بھی ہو لوگ اس کی اصل حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے، ہماری نگاہیں حجابات سے پار نہیں ہونے پاتیں۔

جنگ آزادی کے عظیم قائد اور عظیم دینی رہنما

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ — کے نام کے ساتھ کل تک زبان مدظلہ العالی

کہنے کی عادی تھی، اور اس وقت ہم رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ کے سمجھنے میں ایک اور آہنی حجاب حائل ہو گیا ہے، یہ ان کی سیاسی حیثیت تھی، جیسا کہ کہا جاتا ہے اور آئندہ بھی کہا، لکھا اور شائع کیا جاتا رہے گا، مولانا جنگ آزادی کے بہت بڑے قائد اور رہنما تھے، لوگوں کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہوگی اور شاید مولانا کی انتہائی تعریف اور مدح سمجھی جائے گی، لیکن ایسا نہیں ہے، مولانا کی اصل صورت وحیثیت اس کے پیچھے مستور رہی ہے اور اس حجاب نے بڑے بڑے لوگوں کی نگاہوں سے ان کو اوجھل رکھا ہے۔

اصل تو یہی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ جانتا ہے کہ کون کیا ہے

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (الملك: ١٤)

لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو دوسری حیثیتوں کے جاننے کا تھوڑا بہت موقع ملتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان حجابات کو اٹھائیں اور اس شخص کی اصل صورت اور حیثیت کو سامنے لائیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی اس کا تھوڑا بہت موقع ملا ہے۔

شخصیت کے کچھ پوشیدہ گوشے

میں اپنے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کے کچھ پوشیدہ گوشے جن کو مجھے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا ہے ان لوگوں تک پہنچاؤں جو مولانا کو اب تک کچھ اور سمجھتے رہے ہیں، میں اس وقت آپ کو سامنے رکھ کر اپنی اس آواز کو دور دور تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

مولانا اس وقت وہاں ہیں جہاں ہماری مدح، ستائش کی ان کو ضرورت نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کو اللہ نے دنیا ہی میں اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں انسان مدح و ذم سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کا تذکرہ میں اس وقت اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کی خود ہمیں ضرورت ہے، ہمیں ان کی زندگی پر نظر ڈالنی چاہیے اور اس کے مفید پہلوؤں کو اپنانا اور ان سے سبق لینا چاہیے، دوسری بات یہ ہے کہ جو باتیں میں عرض کروں گا یہ وہ

ہیں جو میرے ذاتی مشاہدہ میں آئیں، ان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، کوئی رنگ آمیزی نہیں ہے، اس لیے کہ ان واقعات کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاص وللّٰہیت

ان کی زندگی کا سب سے پہلا، ممتاز اور اعلیٰ وصف اخلاص وللّٰہیت ہے، افسوس یہ ہے کہ الفاظ کثرت استعمال سے اپنی قیمت اور وزن کھودیتے ہیں، اخلاص بھی انہیں لفظوں میں سے ہے، ہر معمولی دین دار اور ذرا پابند صوم وصلاۃ آدمی کو ہم مخلص کہہ دیتے ہیں، ہمارے نزدیک آدمی کی سب سے پہلی تعریف مخلص ہوتی ہے، حالانکہ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے، کہ مخلص ہونا انسان کی آخری اور انتہائی تعریف ہے

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾(الأنعام:١٦٢)

کے مقام پر پہنچنا آسان نہیں ہے، یہ مقام نبوت کا پرتو ہے، میں نے مولانا کی زندگی میں اس جوہر کو بہت نمایاں دیکھا، ایسا کام جو اخلاص ہی پر مبنی ہو اور جو عام طور پر محض اللہ ہی کے لیے کیا جاتا ہو، اور جس میں کوئی دنیاوی اور مادی نفع نہ ہو، مثلاً: نماز پڑھنا، اس میں اخلاص کا قائم رکھنا زیادہ مشکل نہیں، اگر چہ یہ بات بھی پورے وثوق سے نہیں کہی جاسکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسے کاموں میں بھی محض خال خال اور چند ہی ایک صحیح معنی میں مخلص کہے جانے کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن جو کام اکثر وبیشتر بلکہ تمام تر دنیوی نفع اور فائدہ کے لیے کیے جاتے ہوں، جہاں غیر مخلصین کا مجمع ہو، وہاں اخلاص کا قائم رکھنا بڑا مشکل ہے، نماز اخلاص کے ساتھ پڑھنا آسان ہے، لیکن تجارت، مزدوری، کتابوں کا لکھنا اور شائع کرنا اخلاص کے ساتھ بہت مشکل کام ہے، اور اسی لیے اللہ نے ایسے لوگوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے جو ایسے اعمال میں اپنے اخلاص کو قائم رکھتے ہیں

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ﴾ (النور: ٣٧)

مولانا کی عظمت کا راز: یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی بڑے مقرر تھے، میں آپ کے سامنے صاف کہتا ہوں کہ مولانا کوئی جادو بیان اور شعلہ بار مقرر نہیں تھے، بلکہ وہ بقدر ضرورت ہی تقریر کرتے تھے، لوگ مولانا کے سامنے اس لیے نہیں جھکتے تھے کہ وہ کوئی بڑے مصنف تھے، مولانا کا شمار ملک کے نامور و ممتاز مصنفین میں نہیں، ہر شخص ان کے سامنے چھوٹا نظر آتا تھا اس لیے نہیں کہ دنیا میں ان کا جیسا کوئی عالم نہیں، میں اس کے کہنے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا اور نہ اس میں مولانا کی کوئی تنقیص ہے، بہت بڑا عالم ہوجانا کوئی بڑا کمال نہیں، جو ذرا محنتی، ذہین اور فہیم ہو اور اس کو مطالعہ کا موقع ملے ایک بڑا عالم بن سکتا ہے، مولانا کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ وہ سرتاپا اخلاص تھے، وہ اپنے ہر کام میں اور ہر وقت مخلص تھے، ان کا ادنی سے ادنی اور معمولی سے معمولی اور غیر دینی کام اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا، ان کی ساری سیاسی جد وجہد محض "ابتغاء رضوان اللہ" تھی، وہ صرف اس لیے اس میں منہمک رہے کہ وہ اس کو رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ اس سے قرب الٰہی چاہتے تھے، وہ ان کے لیے "سلوک" بن گیا تھا، یہ ان کے لیے جہاد تھا اور وہ اس میں شرکت سے محض تقرب بالجہاد چاہتے تھے، جس نیت سے وہ رات کو تہجد پڑھتے تھے، آپ یقین کریں کہ اسی نیت سے وہ اسٹیج پر تقریر کرتے تھے، وہ وہاں اس نیت کے ساتھ مشغول رہتے تھے جس نیت سے وہ نوافل پڑھتے تھے، جو ثواب ان کو تہجد کی آٹھ یا دس رکعتوں میں ملتا ہوگا، وہ ان کو رات کے کسی جلسہ کی شرکت میں ملتا ہوگا، جس طرح مجاہد میدان جنگ میں جاتا ہوگا اسی نیت سے جیل خانے جاتے رہے ہوں گے، یہ آسان کام نہیں، یہ مقام وہ ہے جو صرف اہل اللہ کو بھی نہیں، کاملین اولیاء اللہ ہی کو حاصل ہوسکتا ہے، ایک منٹ کے لیے اپنے کو ایسے ماحول میں اللہ کے قریب سمجھنا مشکل ہوتا ہے، چہ جائیکہ وہاں انہوں نے گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں اپنے کو اللہ کے ساتھ مشغول رکھا، اس کی علامت یہ ہے کہ ان کو ان کی یہ سیاسی مشغولیت ان کیفیات سے دور نہیں کرتی تھی، جو اس سے علاحدہ ہوتی تھیں،

جس اسٹیج پر وہ ہوتے تھے وہاں اکثر وہ لوگ بھی ہوتے تھے جنہیں نماز کا بالکل خیال بھی نہیں ہوتا تھا اور بعض اوقات اکثریت غیر مسلموں کی ہوتی تھی، لیکن وہ جلسہ سے اٹھ کر کسی مسجد میں تشریف لے جاتے، وہاں اگر نماز ہو چکی ہے، کسی دوسری مسجد میں تشریف لے جاتے، جہاں جماعت ملتی وہاں پڑھتے، کہیں نہ ملتی تو اپنی علاحدہ جماعت کرتے، یہ ایک مثال ہے، اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جو ان کی زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان کے اخلاص وللّٰہیت اور اللہ کے ساتھ انتہائی تعلق اور مشغولیت کی دلیل ہیں اور یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ کہ یہ آسان کام نہیں، یہ ان کی زندگی کا پہلا جوہر ہے جس نے ان کو وہ بلندی عطا کی جو ان کے سیاسی معاصرین میں کسی کو نہیں ملی۔

اس اخلاص کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس سیاسی جدوجہد میں شروع سے حصہ لیا اور اس وقت تک حصہ لیتے رہے جب تک اس کی ضرورت تھی، لیکن جب ضرورت پوری ہو گئی اور وقت اور موقع آیا اس محنت کی قیمت وصول کرنے کا، تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیے، ایک وقت ہوتا ہے مزدوری کا، ایک مزہ کا، مزدوری پوری کی، مسلسل کی اور محنت ومشقت سے کی، لیکن اجرت وہاں کے لیے اٹھا رکھی جہاں وہ اب ہیں، جب آزادی کا درخت لگایا جا رہا تھا اور اس کی آبیاری کے لیے خون پسینہ کی ضرورت تھی، وہ پیش پیش تھے، لیکن جب اس درخت کے پھل کھانے کا وقت آیا اس وقت وہ اللہ کا بندہ اتنی دور جا بیٹھا جہاں اس کی ہوا بھی نہ لگ سکے، وہ آزادی سے پہلے بھی ایک مدرس تھے، اب بھی وہی مدرس رہے، پہلے بھی ایک مختصر سی تنخواہ پاتے تھے اب بھی وہی پاتے رہے،(۱) آزادی کی جدوجہد کے رفیقوں اور ہم سفروں میں وہی ایک شخص تھے جن کا دامن دنیوی منفعت کے داغ اور آلودگی سے پاک رہا اور بلاواسطہ اور بالواسطہ وہ کسی طرح اپنے صاحب اقتدار وبااختیار رفیقوں کے ممنون نہیں ہوئے۔

(۱) دارالعلوم دیوبند نے ان کی تدریسی خدمات حاصل کیں اور وہ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے

عالی حوصلگی اور عزیمت

۲-مولانا کی زندگی میں دوسرا نمایاں وصف ان کا عزم وعالی ہمتی تھی، مسلمانوں میں بالعموم اور طبقہ علماء میں بالخصوص قوت ارادی کی بڑی کمی نظر آتی ہے، دماغی اور ذہنی حیثیت سے بڑے بڑے ممتاز لوگ ہوں گے اور ہیں لیکن یہ جوہر نایاب ہے، دینی و علمی حلقہ میں مولانا جس چیز میں ممتاز تھے وہ بلند حوصلگی ہے، جس چیز کو رضائے الٰہی کے لیے ضروری سمجھا اس کو انہوں نے بڑی خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلا اور برداشت کیا، بلکہ دعوت دی خواہ وہ کیسی ہی تکلیف دہ، صبر آزما اور ہمت شکن ہو، انہوں نے اس وقت کئی کئی برس جیل کاٹے ہیں جب جیل جانا آسان کام نہیں تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی بڑی چیز اور بظاہر زیادہ سخت چیز کا مقابلہ کر لیتا ہے، لیکن بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، حکومت سے ٹکر لینا اور اس کی سختیوں اور مظالم کو برداشت کرنا آسان ہے، لیکن بعض گھریلو معاملات اور گھریلو تعلقات کے سامنے پاؤں پھسل جاتے ہیں، لیکن مولانا نے ہر چیز کا مقابلہ کیا، انہوں نے کوئی کام اپنی زندگی میں اس لیے چھوڑ نا کیا معنی، ملتوی نہیں کیا کہ وہ مشکل ہے، ہم آپ سب جانتے ہیں کہ وہ کثرت سے سفر کرتے تھے، سیاسی وغیر سیاسی، دینی وغیر دینی حلقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے ان کے برابر سفر کئے ہوں، پھر ان سفروں میں لوگوں سے ملنا، باتیں کرنا، تقریریں کرنا، معمولات کا پورا کرنا، جو لوگ مولانا سے قریب رہے ہیں وہ ان کے جوہر سے کسی قدر واقف ہیں، لوگوں کی دل جوئی اور محبین کی خوشی کی لیے بڑے بڑے مشکل اور طویل سفر اپنے ذمہ لے لیتے، جگہ جگہ ٹھہرتے اور عزیزوں او دوستوں کی فرمائشیں پوری کرتے، نہ بڑھاپا ان کے لیے رکاوٹ تھا، نہ بیماری، مصروفیت، پھر مختلف بلکہ متضاد مشاغل اور ذمہ داریوں کا جمع کرنا بغیر اعلیٰ درجہ کے عزم اور قوت ارادی کے ممکن نہ تھا، مولانا کو وہ عزم اور طبیعت کا استقلال ملا تھا جو ملکوں اور قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کر دیتا ہے، مگر افسوس کہ اس سے پورا فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔

دینی انہماک و دینی مصروفیت میں صاحب کرامات شخصیت

۴-دینی انہماک اور دینی مصروفیت، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان سے کچھ قریب رہے ہیں، ایسا مسلسل اور انتھک کام کرنے والا اور نہ اکتانے اور نہ گھبرانے والا انسان کم نظر آیا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ جو مولانا کی مصروفیت کو دیکھتے تھے وہ گھبرا جاتے تھے اور پریشان ہو جاتے تھے کہ مولانا اتنا کام کیسے کرتے ہیں، سیکڑوں آدمیوں سے ملنا، درجنوں مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، ایک ایک سے اس کے مطلب اور ضرورت کی بات کرنا، حتی کہ تعویذ چاہنے والوں کو تعویذ دینا، پھر اسی میں حدیث کے درس کی تیاری کرنا اور کئی کئی وقت، صبح شام، ظہر بعد، عشاء بعد دیر رات تک درس دینا، اور درس بھی ایسا عالمانہ و فاضلانہ جو ان کے منصب کے مطابق تھا، پھر خطوط کا جواب دینا، جب تک خود لکھ سکنے کے قابل رہے خود ہی جواب لکھتے رہے، آخر میں دوسروں سے لکھوانے لگے تھے، لیکن پھر بھی بہت سے خطوط اپنے قلم سے لکھتے، میرا خیال ہے کہ دینی شخصیتوں میں سے کسی کے پاس اتنی ڈاک نہ آتی ہوگی جتنی مولانا کے پاس آتی تھی، اس لیے کہ مولانا کی حیثیت سیاسی لیڈر کی بھی تھی، شیخ طریقت کی بھی تھی، (۱) اور ایک عالم دین کی بھی تھی، مہمانوں کا اکرام کرنا، ایک ایک شخص کی طرف خصوصی توجہ، اس کی ضرورت پوری کرنا اور وہ بھی پوری بشاشت، انبساط و انشراح کے ساتھ، کرامت نہیں تو اور کیا ہے، واقعہ یہ ہے دینی امور میں اتنا انہماک و سرگرمی، یا تو میں نے مولانا الیاس صاحب میں دیکھی (۲) یا مولاناؒ میں، مولانا الیاسؒ میں اپنے رنگ میں اور مولانا میں اپنے رنگ میں، رات کو دس بجے کہیں سفر سے واپس آئے، اسی وقت طلبہ کو اطلاع ہوئی کہ درس ہوگا، کیسی نیند، کہاں کا

---

(۱) وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کے خلیفہ تھے، جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) کے اور وہ میانجی نور محمد جھنجھانوی (م ۱۲۵۹ھ) کے تھے، میانجی نور محمد جھنجھانوی کو حضرت حاجی عبد الرحیم ولایتی (ش ۱۲۴۶ھ) سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

(۲) حضرت مولانا الیاس کاندھلوی، بانی جماعت تبلیغ (۱۳۶۳ھ، ۱۹۴۴ء

تکان، پورے نشاط کے ساتھ درس دیا، اسی میں طلبہ کے سوالات کے جوابات اور وہ بھی غیر متعلق سوالات کے جوابات...... آپ تعجب سے سنیں گے کہ حج کے سفر سے واپس آئے ہیں جس سفر کے بعد مہینوں لوگ تھکن اتارتے ہیں، اور کس طرح آئے ہیں کہ راستہ میں ہر بڑے اسٹیشن پر متعلقین ومحبین سے مصافحہ کرتے، مزاج پوچھتے، ملاقات کرتے آئے ہیں، آتے ہی حکم ہوا کہ سبق ہوگا، بتایئے سیاسی لیڈروں میں یہ واقعہ مل سکتا ہے کہ مشاہیر عصر میں؟ بغیر انتہائی تعلق مع اللہ کے یہ ممکن نہیں، یہ ہیں وہ کرامتیں جو بڑی بڑی حسی کرامتوں سے بدرجہا بلند ہیں۔

نسخہ آدمیت

مولانا کا چوتھا وصف ان کی آدمیت اور انسانیت ہے، آدمیت ایک خاص لفظ ہے اور خاص معنی میں بولا جاتا ہے، معمولی بات نہیں

ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ جب کسی کی بڑی تعریف کرتے تو فرماتے "وہ نسخہ آدمیت" ہے، ایک شخص کی وفات ہوئی تو فرمایا: "مردند و آدمیت بخاک بردند" آج مولانا کے بارے میں بھی یہی جملہ بجا طور پر دہرایا جا سکتا ہے، مولانا کی اس صفت و خصوصیت کا اندازہ ان کے مکارم اخلاق سے ہوتا ہے، دوسروں کو حتی کہ معاندین و مخالفین تک کو نفع پہنچانے کی کوشش کرتے، خود تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں، لیکن دوسروں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی فکر کر رہے ہیں، ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی مہمان تھکا ماندہ کہیں سے آیا ہوا رات کو سو رہا ہے اور مولانا اس کے پیر دبا رہے ہیں، مہمان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ پیر دبانے والے مولانا ہو سکتے ہیں اور یہی نہیں جنہوں نے ان کو تکلیفیں پہنچائیں، مولانا نے ان کے ساتھ سلوک و احسان کیا اور ہمیشہ نفع رسانی اور خدمت کی فکر میں رہتے اور جب بھی ، جس طرح بھی موقع ملا ہے اس کو آرام و نفع پہنچایا ہے، دوسروں سے اگر اس کو کام پڑا ہے تو سفارش کی ہے، خود جا سکے تو جا کر کی

ہے، پیغام کے ذریعہ سے ممکن ہوا تو پیغام بھیجا ہے، جس کے جیسے حقوق ہوتے اور جس کا جیسا مرتبہ ہوا اور جس کو جیسی ضرورت ہوئی اسی کے شایان شان پورا کیا ہے، براہ راست ان مخالفین کو ضرورت پڑی تو ان کی ضرورت پوری کی اور اگر ان کے عزیزوں میں سے کسی کو ضرورت ہوئی ہے تو ان کی کار براری کی اور ان کے واسطے سے اپنے ان معاندین کی راحت رسانی کی، انہوں نے اپنے مخالفین و معاندین کو معاف بھی کیا، ان کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے، ان کا عمل وہ تھا جو کسی عارف نے کہا ہے ۔

ہر کہ مارا یار نہ بود ایزد او را یار باد
ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد
ہر کہ در راہ صنم خار نہد از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد گلزار باد

"وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل"

ہماری آپ کی بدقسمتی تھی کہ ہم نے جانا نہیں کہ وہ کیسے باطنی مراتب پر فائز تھے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جو اس کوچہ سے واقف ہوں، اور جو اس کا احساس رکھتے ہوں، وقت کے عارفین و اہل نظر کی زبان سے میں نے ان کے لیے بڑے بلند کلمات سنے ہیں،[1] اور ان سب کو ان کی عظمت و بلندی کا معترف اور ان کی مدح و توصیف میں رطب اللسان پایا ہے، مولانا اپنے زمانہ میں ڈاکٹر اقبالؒ کے ان اشعار کا کامل نمونہ و مصداق تھے ۔

ستروین مارا خبر او را نظر
او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش

(۱) خصوصاً حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش
ما ہمہ عبد فرنگ او عبدہ
او نگنجد در جہان رنگ و بو

ڈاکٹر صاحب نے کبھی کہا تھا۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

مولانا کا عمل پہلے مسلک پر تھا، یہ واقعہ ہے کہ وسعت افلاک میں مولانا کی زندگی تکبیر مسلسل تھی۔

عصمت، انبیاء کے ساتھ خاص ہے

یہ میں کہوں گا کہ مولانا معصوم نہیں تھے، ایسا نہیں ہے کہ ان سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو، ضروری نہیں کہ ان کی تمام سیاسی اور اجتہادی آراء و نظریات میں ان سے اتفاق کیا جائے، (۱) لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ جو کچھ انہوں نے کہا یا کیا محض رضائے الٰہی اور حمیت دینی میں، ان کے لیے کوئی دنیوی محرک یا مصلحت نہ تھی۔

جذبہ تشکر اور حمیت دینی

مولانا کا چھٹا بڑا وصف ان کا اپنے بزرگوں، اساتذہ اور شیوخ سے عاشقانہ تعلق ہے (۲) واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کی شخصیت کی کنجی ہے، اور ان کی ساری زندگی اور اس کے اہم

(۱) مشائخ کبار میں خصوصاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۴۳ء) کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ سے سیاسی آراء و نظریات میں اختلاف تھا، اور دونوں ہی کا اختلاف دین و ملت کے مفاد میں تھا۔

(۲) خصوصاً اپنے اسلاف میں امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ اور اساتذہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور شیوخ میں اپنے شیخ اور اپنے استاد کے بھی شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بڑا والہانہ اور عاشقانہ تعلق تھا، مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ان کی خود نوشت سوانح حیات ''نقوش حیات'' اور مکتوبات جو تین جلدوں میں ''مکتوبات شیخ الاسلام'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

اور عظیم واقعات کا راز یہ ہے، یہ چیز ایسی تھی جوان کے رگ وپے میں سرایت کر گئی تھی، ان کا یہ تعلق ان کو بعض ایسی چیزوں پر آمادہ کر دیتا تھا جوان کے عام اخلاق وصفات کے خلاف ہوتیں، اور بعض دفعہ سمجھ میں نہ آتیں کہ یہ کیسے ہوا، یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا اپنی بڑی سے بڑی توہین اور اذیت برداشت کر سکتے تھے مگر اپنے اکابر واسلاف اور شیوخ واساتذہ کی تنقیص اوران کا استخفاف برداشت نہ کر سکتے تھے، بعض مرتبہ یہ چیز ان کی شدید بیزاری ومخالفت کا سبب بن جاتی، آخر میں اپنے اسلاف کی امانت کی حفاظت اوران کے نقش قدم پر چلنے اوران کے مسلک پر قائم رہنے کا جذبہ بہت شدید ہو گیا تھا اور وہ اس راستہ سے بال بھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے تھے، اسی طرح سے خلاف شریعت فعل کے دیکھنے کا تحمل نہیں رہا تھا، اور یہ تاثر ان کے عام اخلاق پر بھی غالب آ گیا تھا۔

عزم واستقلال اور ثبات واستقامت

مولانا کا ایک بہت بڑا کارنامہ جس کی اہمیت کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے، یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء کے ہنگامہ میں اوراس کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے بقاو قیام کا ایک بڑا ظاہری سبب مولانا ہی کی ہستی تھی، یہ وہ وقت تھا کہ سب بڑے بڑے کوہ استقامت جنبش میں آ گئے، سب یہی سمجھتے تھے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں، مسلمانوں کی تاریخ میں دو ہی چار ایسے دور گزرے ہیں جب مسلمانوں کے اوراسلام کے بقا کا سوال آ گیا ہے، ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی نوعیت کا تھا، اصل مسئلہ سہارن پور کے مسلمانوں کا تھا، سارا دارومدار ان پر تھا، یہ اپنی جگہ چھوڑتے تو یوپی کے مسلمانوں کے قدم لغزش میں آجاتے، اور سہارنپور کے مسلمانوں کا انحصار سارا کا سارا دو ہستیوں (رائے پور، سہارن پور کی بزرگ شخصیت) حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ [1] اور (دار العلوم

---

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ تقریر فرمائی اس وقت ان کے مربی ومرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری بقید حیات تھے، اس کے چار سال بعد ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں انہوں نے بھی لاہور (پاکستان) میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وغفرلہ مغفرۃ تامۃ

دیو بند کے شیخ الحدیث) حضرت مولانا مدنی پر تھا، (ان کے اس عزم و مقصد میں مظاہر العلوم سہارن پور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ برابر کے شریک تھے) اس وقت مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ جمنا کے کنارے ہونا تھا، لیکن یہ اصحاب عزم مجاہد بندے وہاں جمے رہے، اور انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے، (ایک سہارن پور کے مشہور قصبہ) رائے پور کی نہر کے کنارے بیٹھ گیا اور ایک دیو بند میں، آپ کو معلوم ہوگا یہ رائے پور سہارن پور و دیو بند مشرقی پنجاب کے ان اضلاع سے جہاں کشت و خون کا ہنگامہ گرم تھا، متصل ہیں، لیکن یہ اللہ کے بندے پورے عزم و استقلال کے ساتھ جمے رہے اور انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اسلام کو یہاں رہنا ہے اور رہے گا، انہوں نے کہا: مسلمانوں کا یہاں سے نکلنا صحیح نہیں، اگر تم مشورہ چاہتے ہو تو ہم مشورہ دیتے ہیں ااور اگر فتوے کی ضرورت ہے تو ہم فتوی دینے کو تیار ہیں کہ یہاں سے اس وقت مسلمانوں کا نکلنا درست نہیں۔

فیوض و برکات کا لامتناہی سلسلہ

اس وقت جو ہندوستان میں اسلام و مسلمان قائم ہیں، یہ انہیں بزرگوں کا احسان ہے، ہندوستان میں اس وقت جو مسجدیں قائم ہیں اور ان میں جو نمازیں پڑھی جارہی ہیں اور پڑھی جاتی رہیں گی یہ ان کا طفیل ہے، ہندوستان میں جتنے مدرسے اور خانقاہیں ہیں اور ان سے جو فیوض و برکات صادر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے انہیں کے رہین منت ہوں گے، اور اس سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا، اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد صاحبؒ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا، ایمان آفریں اور ولولہ انگیز تقریریں کیں، اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ، اپنی تقریروں اور خود اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے، اپنے ملک کو اپنا سمجھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔

ملی احساسات اور درد و سوز

یہ بات میں اور واضح کردوں کہ مولانا کے بارے میں لوگوں کو یہ بڑا مغالطہ ہے

کہ وہ موجودہ حالات سے کلی طور پر مطمئن تھے، قریب کے لوگ جانتے ہیں کہ مولانا کے سینہ کے اندر کیسا دردوسوز، کیسے اسلامی جذبات اور کیسی دینی حمیت موجزن تھی، اور ان کے اندرونی احساسات کیا تھے، مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کو مولانا کے ان جذبات اور اندرونی احساسات اور امت اسلامیہ اور اس کے مسائل کے ساتھ گہرے تعلق اور دردوسوز کا اندازہ نہ ہوسکا، اور مولانا کی زندگی کا یہ پہلو جتنا روشن اور معروف ہونا چاہیے تھا روشن اور عام طور پر معروف نہ ہوسکا، آزدی کے بعد جو خلاف توقع حالات وتغیرات اس ملک میں پیش آئے انہوں نے مولانا کی طبیعت کو بہت افسردہ کردیا تھا، ان کی عمر کا بہترین زمانہ اور ان کی بہترین قوتیں انگریزی حکومت کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوچکی تھیں، اور اس معرکہ میں وہ کامیاب ہوچکے تھے، اب ان کی ضعیفی افسردگی اور بے تعلقی کا زمانہ تھا۔

آخری ایام

آخر میں ان کی تقریروں کا موضوع اور دعوت صرف ذکر کی تلقین کرنا، خاتمہ کی فکر کی طرف متوجہ کرنا، تعلق مع اللہ اور ایمان باللہ کو مضبوط سے مضبوط کرنا، دینی شعائر کا احیاء اور سنت نبویہ کی کثرت سے ترویج واشاعت رہ گئی تھی، انہوں نے اپنے عالی مرتبہ شیوخ و اساتذہ سے تعلق مع اللہ، استقامت علی الشریعت اور باطنی مشغولیت کی جو دولت حاصل کی تھی، تمام اسفار ومشاغل وہجوم خلائق، درس وتدریس کی مصروفیت، اور آخر آخر میں علالت کی شدت میں بھی وہ اسی میں مشغول تھے، اور روز بروز وہ ہر چیز پر غالب آتی جارہی تھی، زندگی کے آخری ایام تک نماز کھڑے ہوکر اور باجماعت ادا کی، یہ ناچیز آخری بار ۲۵/نومبر کو یعنی وفات سے صرف گیارہ روز پہلے حاضر ہوا، سخت تکلیف اور بے حد ضعف تھا، یہ وہی دن تھا جس ڈاکٹر صاحب نے تفصیلی معائنہ کرکے یہ کہا تھا کہ مولانا صرف اپنی قوت ارادی سے زندہ ہیں، اور ہمارا فن اس علالت کے سامنے ناکام ہے، اس روز بھی مولانا نے ظہر کی نماز کھڑے ہوکر اور باہر آکر جماعت کے ساتھ ادا کی۔

بشاشت اور خوش مزاجی

مولانا کی خدمت میں جب جب حاضری ہوئی تو پوری بشاشت اور استقلال کے ساتھ گفتگو فرمائی، ایک کتاب کے پہنچنے کا ذکر کیا، میں نے عرض کیا: مجھے معلوم ہوتا کہ علالت وضعف اس درجہ تک پہنچ گیا ہے تو کبھی اس کے پیش کرنے کی جرات نہ کرتا، فرمایا: کیوں؟ میں نے تو کئی صفحات کا مطالعہ کیا، اور نفس کتاب ہی بڑی نعمت ہے، اسی مجلس میں ایک مخلص نے جو باہر سے ملنے آئے تھے روتے ہوئے کہا کہ دنیا خالی ہوتی جارہی ہے، فرمایا: نہیں، دنیا میں بہت لوگ ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ ہمیں دوسروں سے کیا تعلق؟ فرمایا: ہمیں تو امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہے۔

امت محمدیؐ سے تعلق

مولانا نے امت محمدی کی خدمت میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، انہوں نے اپنے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اور اپنے اسلاف سے جو امانت اور ذمہ داری پائی تھی اس کو پورا کر گئے، ان کو نہ ستائش کی تمنا ہے، نہ صلہ کی پرواہ، نہ مدح وتوصیف کا انتظار ہے، نہ ناسپاسی اور ناشناسی کا گلہ، وہ مسلمانوں کو خطاب کر کے کہہ سکتے ہیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے (۱)

---

(۱) یہ مضمون اصلا وہ خطاب تعزیت ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہو کر مسجد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں طلبہ دار العلوم کے سامنے حضرت مولانا قدس سرہ نے کیا تھا، جسے ''الفرقان'' لکھنؤ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے شائع کیا تھا، بعد میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے مقدمہ کے ساتھ رسالہ کی شکل میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ (محمود)

باب ہفتم

معاصر علماء ومشائخ کا تعلق، عقیدت واحترام اور ممتاز اصحاب علم وفضل کا تعلق بیعت وارادت

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی دونوں (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں) گئے، تو حضرت تھانوی نے فرمایا کہ آپ حضرات کو زیادہ مناسبت مولانا حسین احمد مدنی سے ہے، آپ ان سے بیعت ہو جائیں، ویسے خدمت کو میں حاضر ہوں (۱)

(۱) ماخوذ از: تعزیتی تقریر، بر وفات مولانا عبدالباری ندوی، مسجد دار العلوم ندوۃ العلماء، تعمیر حیات، شمارہ نمبر ۱۰/ ۲۵ فروری ۱۹۷۶ء)

جہاں تک علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ہے، ان کو بھی مناسبت پہلے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی طرف زیادہ تھی، اور ان سے زیادہ عقیدت ومحبت محسوس ہوتی تھی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے معارف سلیمان نمبر (۱۹۵۵ء) میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے اخلاق وسیرت کے کچھ نمونے کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

"مولانا سید حسین احمد مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، جب ان میں تصوف وسلوک کا ذوق پیدا ہوا تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کی جانب ان کا میلان ہوا، اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر............... (باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

میں دیو بند ۱۳۵۰ھ - ۱۹۳۱ء میں حاضر ہوا، اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، دیو بند کے ایک سفر کے موقع پر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے عم محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیو بند ہی تشریف رکھتے تھے، مولانا مدنی کے دولت کدہ پر ان سے نیاز حاصل ہوا، پھر کئی بار دولت خانہ پر بھی حاضر ہوا۔ (۱)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ

مجھے دار العلوم دیو بند میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے دولت کدہ پر ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں پہلی بار مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب بہاری کی زیارت اور بار بار ان کی مجلسوں اور صحبتوں میں شرکت اور یکجائی کی سعادت حاصل ہوئی، میں نے مولانا مدنی کو کسی کا ان سے زیادہ احترام کرتے نہیں دیکھا، یہ میری نوعمری اور طالب

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تشریف فرما ہیں، اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر وہ خود حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں، یکایک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علی کے سامنے پیش کر کے فرمایا: ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں، اسی خواب کے بعد وہ مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔"

حضرت تھانوی اور حضرت مدنی کے ایک دوسرے کے پاس ولحاظ اور ایک دوسرے سے تعلق ومحبت اور ایک دوسرے کے اہل محبت وعقیدت کے لحاظ وسرپرستی وتربیت کا معاملہ ہے کہ ان تینوں جلیل القدر عالموں کو اپنے دامن تربیت میں لے کر فائز المرام کیا، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا عبدالباری ندوی کو اجازت بیعت سے بھی سرفراز کیا، اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے متعلق تو اشعار کہے جس کا ایک بند یہ ہے کہ ۔

از سلیماں گیر اخلاص عمل　　داں تو ندوی را منزہ از دغل

(محمود)

(۱) پرانے چراغ، جلد سوم، ص: ۱۴۱-۱۴۲

علمی کا زمانہ تھا، اس لیے میں ان کے علمی مقام کو سمجھ نہیں سکتا تھا، پھر جب خوش قسمتی سے ان کا مولانا مدنی کی رفاقت میں دو تین ہفتے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے مکان پر لکھنؤ میں مدح صحابہ کی تحریک کے سلسلہ میں ۱۹۳۸ء میں قیام رہا تو میں نے ان کو اور زیادہ قریب سے دیکھا، اور علم وشعور کی اس منزل میں دیکھا جب مطالعہ و تجربہ کچھ آگے بڑھ چکا تھا۔ (۱)

مولانا احمد علی لاہوریؒ

حضرت مولانا احمد علی لاہوری جہاں اہل دنیا اور اہل دولت کے سامنے بڑے خود دار اور غیور واقع ہوئے تھے، اہل دین اور خصوصیت کے ساتھ ان حضرات کے سامنے جن کو اپنے مشائخ اور اکابر کی صف میں شمار کرتے تھے، غایت درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، علمائے حق سے بہت جھک کر اور فروتنی سے ملتے تھے اور ان کی نہایت تعظیم کرتے تھے، دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا اپنے کو ان کے سامنے ایک معمولی طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتے، معاصر علماء و مشائخ میں سے ان کو دو شخصیتوں سے بے حد عقیدت تھی، اور وہ ان کے ساتھ اپنے مشائخ کا سا معاملہ کرتے تھے، ایک مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور دوسرے مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ۔ (۲)

مولانا ابوالکلام آزادؒ

مولانا ایک مرتبہ حکومت یوپی کی دعوت اور سمپورنانند جی کی وزارت تعلیم کے زمانہ میں عربی مدارس کے نصاب کی نئی ترتیب و ترقی کی تجویز کے مقع پر تشریف لائے ہوئے تھے، یہ فروری ۱۹۴۷ء کی بات ہے، اس موقع پر انہوں نے یوپی اسمبلی کے ایک بالائی ہال میں مدارس عربیہ کے ذمہ داروں اور علماء و فضلاء کے سامنے نصاب درس کے ارتقاء اور اس کے عناصر ترکیبی پر ایک فاضلانہ تقریر فرمائی جس سے اندازہ ہوتا تھا

(۱) پرانے چراغ، حصہ سوم، ص: ۱۳۰ (۲) پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ۱۳۷، طبع جدید

کہ مولانا کے سیاسی مشاغل نے ان کو علم کے اس قافلہ سے بچھڑنے نہیں دیا ہے، جس کے وہ اوائل عمر میں ہم سفر رہے، ان کے سامنے ایک مختصر سی یادداشت تھی، جس میں انہوں نے دہلی سے لکھنؤ تک کے ہوائی سفر میں کچھ پوائنٹس لکھ لیے تھے، اس موقع پر مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب اور دوسرے علمائے فرنگی محل واساتذۂ مدارس موجود تھے، ان میں سب کو مولانا کا احترام اور ان کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھا۔ (۱)

......جب مولانا حسین احمد مدنی کی دعوت پر دہلی اس کے لیے گیا تاکہ وہ مولانا کو میری موجودگی میں والد صاحب کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' کی طرف توجہ دلائیں، جس کی چار پانچ جلدیں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے شائع کی تھیں، لیکن پولیس ایکشن کے بعد اس کا سلسلہ رک گیا تھا، یہ ملاقات جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسہ میں ہوئی، (۲) جو گلی قاسم خان میں ہو رہا تھا، مولانا آزاد تشریف لائے تو مولانا مدنی نے میرا تعارف کرایا، اور نزہۃ الخواطر کا ذکر کیا، مولانا نے اپنی واقفیت اور دلچسپی کا اظہار کیا، اور فرمایا: اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہیے، میں نے عرض کیا کہ کیا یاد دہانی کی ضرورت ہوگی؟ تو فرمایا: نہیں، چنانچہ ایسے ہی ہوا، دائرہ سے اس کے بقیہ حصے طلب کیے گئے، اور پوری کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔ (۳)

مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

۸/۹/۱۰ ذی قعدہ ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۸/۲۹/۳۰ نومبر ۱۹۴۱ء کو نوح (گوڑگاؤں)

---

(۱) پرانے چراغ، حصہ دوم، ص: ۴۸

(۲) جمعیۃ العلماء کے صدر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تھے، اور کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے، اور دونوں کے اشتراک عمل سے آزادیٔ ہند کی تحریک چل رہی تھی، جو ملک کو تقسیم سے روک کر برطانوی استعمار سے آزاد کرنا چاہتی تھی، ان ملاقاتوں اور پروگراموں میں شرکت سے دونوں کا خصوصی تعلق ظاہر ہوتا ہے) (محمود)

(۳) پرانے چراغ، حصہ دوم، ص: ۵۰

میں ایک عظیم الشان تبلیغی جلسہ ہوا، میوات کی سرزمین نے انسانوں کا اتنا بڑا اجتماع ایک جگہ کبھی نہیں دیکھا تھا، شرکائے جلسہ کی تعداد کا تحقیقی اندازہ ۲۰-۲۵ ہزار کیا جاتا تھا، ان شرکاء میں بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو ۳۰-۳۰، ۴۰-۴۰ کوس پیدل چل کر اپنا سامان کندھے پر لاد کر اور اپنا کھانا باندھ کر آئے تھے، خصوصی مہمانوں کی تعداد بھی جو بیرون میوات سے تشریف لائے تھے، اور دونوں وقت مدرسہ معین الاسلام کی عمارت میں پرتکلف کھانا کھاتے تھے، ایک ہزار کے قریب تھی۔

جلسہ کے وسیع شامیانے کے نیچے، مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے جمعہ کی نماز پڑھائی، جامع مسجد میں اور قصبے کی تقریباً سب مسجدوں میں نماز ہوئی، پھر بھی ہجوم اتنا تھا کہ چھتوں اور بالاخانوں پر آدمی ہی آدمی تھے، سڑکوں پر بھی نمازیوں کی صفیں تھیں، اور آمد و رفت بند ہوگئی تھی، نماز اور جلسہ شروع ہوا، صبح سے رات تک اجلاس ہوتے تھے، لیکن نہ کوئی صدر جلسہ تھا، نہ مجلس استقبالیہ، اور صدر استقبالیہ، نہ رضا کار، لیکن تمام انتظامات کوش اسلوبی سے ہو رہے تھے، کام کرنے والوں میں ایسی مستعدی اور فرض شناسی تھی، جو وردی پوش رضا کاروں کی منظم جماعتوں میں نہیں دیکھی گئی، اس اجتماع میں دہلی کے عوام و خواص اور ہر طبقہ کے حضرات بکثرت شریک تھے، خان بہادر حاجی رشید احمد صاحب، حاجی وجیہ الدین صاحب، جناب محمد شفیع صاحب قریشی وغیرہ، حضرات اپنی اپنی کاروں میں تشریف لے گئے، جن سے مہمانوں اور علماء کی آمد و رفت میں بڑی سہولت رہی۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے اس جلسہ کے متعلق اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ۳۵/ سال سے ہر قسم کے مذہبی اور سیاسی جلسوں میں شریک ہو رہا ہوں، لیکن میں نے اس شان کا ایسا بابرکت اجتماع آج تک نہیں دیکھا۔

یہ اجتماع اور انسانوں کا یہ جنگل ایک جلسہ سے زیادہ ایک زندہ خانقاہ تھی، دن کے سپاہی رات کے راہب بن جاتے تھے، اور رات کے عبادت گذار دن کے

خدامت گزار نظر آتے تھے۔ ان دنوں چیزوں کا جمع کرنا اس دعوت کے مقاصد میں سے تھا۔ (۱)

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل سنت کو صحابہ کے مقام، ان کے حقوق اور ان کے فضائل ومناقب سے واقف کرانے اور ان اثرات کو زائل کرنے کے لیے مواعظ کا سلسلہ شروع کیا، جو ہندوستان میں عہد مغلیہ کے دور آخر میں علی العموم اور نوابان اودھ کی سلطنت کے اثر سے لکھنؤ اور اس کے اطراف میں علی الخصوص اہل سنت کے ذہنوں، مزاجوں اور ان کے تمدن ومعاشرت میں داخل و جاری وساری ہوگئے تھے، ان مواعظ نے اور اس کے اطراف میں اصلاح وانقلاب کا وہ کام کیا جو ان کے مناظروں نے اور مناظرانہ رسائل نے نہیں کیا، جن کی ہندوستان کے سنی حلقوں میں دھوم مچی ہوئی ہے، ان کے یہ مواعظ بڑے مؤثر اور دل پذیر ہوتے، نپے تلے الفاظ، سادہ زبان، مغز کی بات، اندرونی جذبہ غرض کہ

ع ہرچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد

کے مصداق، صحابہ کرام کے فضائل وحقوق بیان کرنے کے ساتھ مولانا قرآن مجید کے محفوظ اور غیر محرف ہونے اور اس کے اعجاز پر بھی روشنی ڈالتے، ان کی تقریروں میں نماز کی تبلیغ کا عنصر ضرور ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کتنے بندگان خدا کو ان کے مواعظ سے نفع پہنچا، اور ان کی زندگیاں بدل گئیں، کم سے کم ہمارے شہر لکھنؤ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے دورہ ۱۲۳۴ھ کے بعد ایسی اصلاحی وانقلابی لہر نہیں آئی، چکمنڈی جو مولانا کے معتقدین کا خاص محلہ ہے، چونکہ ہمارے محلہ سے قریب تھا، اور دونوں محلوں میں ایک ہی (قریشی) برداری رہتی تھی، جو مولانا کی خاص طور سے حلقہ بگوش اور ان کی تحریک ودعوت میں پیش پیش تھی، اس لیے مجھے ان اثرات کے مطالعہ

---

(۱) بحوالہ: مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، بعنوان: نوح کا بڑا جلسہ

کرنے اور مولانا کی شخصیت کی دلآویزی اور مواعظ دل پذیری سے واقف ہونے کا زیادہ موقع ملا۔

پھر وہ وقت آیا کہ لکھنؤ میں "مدح صحابہ" کی تحریک شروع ہوئی، اور ۱۹۳۹ء میں مولانا حسین احمد مدنی (صدر جمعیۃ العلماء) اور شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند اس کی رہنمائی کے لیے لکھنؤ تشریف لائے اور ہمارے ہی مکان پر قیام فرمایا، اس سلسلہ میں مولانا کی بار بار زیارت ہوئی، اس معاملہ میں ان کا سوز دروں، جذبہ کامل، اور ان کا استغراق دیکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحابہ کرام کے ذکر اور ایک ایسے ماحول و معاشرہ میں جو مختلف اسباب کی بنا پر ان کے حقیقی مقام سے نا آشنا ہو گیا تھا، اس کو روشن واجاگر کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، اس کے سوا ان کی زندگی کا کوئی مقصد اور مشغلہ نہیں۔ (۱)

حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ محبت و عقیدت، احترام و اعتماد کا غیر معمولی معاملہ تھا، تقسیم سے پیشتر اور اس کے بعد بھی مولانا کی تائید و حمایت اور ان کی ذات کے ساتھ اپنے تعلق و عقیدت کے اظہار کا آپ پر ایسا جوش تھا کہ آپ اس میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، بلکہ جس مجلس میں مولانا کا کوئی ناقد یا مخالف ہوتا وہاں اور زیادہ جوش کے ساتھ ان کے فضائل و مناقب بیان کرتے اور ان کے خلوص و مقبولیت کا اعلان فرماتے، ایک مرتبہ کسی ایسے ہی موقع پر جب یہ ناچیز بھی حاضر تھا اور شاید کچھ مخالفین بھی تھے بڑے جوش کے ساتھ فرمایا: ان کے مخالفین ذرا ان کے چہرہ کو بھی دیکھیں، اور اپنے چہرہ کو بھی، ایک مرتبہ بعض آنے والوں نے مولانا کے سیاسی مسلک اور ان کے سیاسی انہماک پر کچھ اعتراض کیا یا اپنے تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا کہ "اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ان کے سفروں میں خادم کی طرح ان کے ساتھ رہتا

(۱) بحوالہ: پرانے چراغ، حصہ دوم، ص: ۱۹۳-۱۹۴، طبع جدید

اوران کی ادنی ادنی خدمتیں انجام دیتا‘‘۔

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے ساتھ جو معاملہ تھا اور آپ کے دل میں حضرت کی جو محبت و عزت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے ایک خادم مولوی مقبول احمد صاحب (ساکن ملسیان، حال مدرس جامعہ رشیدیہ منٹگمری) نے سنایا، وہ فرماتے ہیں:

’’۱۰/صفر ۶۷-۱۹۴۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا، مارچ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں اچانک حضرت رائے پوری کا والانامہ جو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (نومسلم) کے قلم سے تھا موصول ہوا، جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے احقر سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا پروگرام معلوم کیا تھا کہ آیا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس جمعہ کو دیوبند میں مقیم ہوں گے یا سفر کا ارادہ ہے؟ حضرت رائے پوریؒ نے بھی یہ تحریر فرمایا کہ اپنے طور پر تحقیق کر کے جواب لکھیں، احقر عصر کے بعد حسب معمول حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر حاضر ہوا، قبیل مغرب جب مجلس برخاست ہوئی تو احقر نے حضرت سے دریافت کیا کہ حضرت اس جمعہ کو قیام ہوگا یا سفر کا نظام ہے؟ حضرت نے فرمایا: کیوں پوچھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: حضرت ویسے ہی پوچھ رہا ہوں، ہنس کر فرمانے لگے کہ سی آئی ڈی تو نہیں ہو، میں بہت گھبرایا، میں نے اپنے جان بچانے کے لیے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی پیش کر دیا، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا اور بوسہ دے کر پیشانی پر لگایا اور فرمایا کہ اس کا جواب میں خود تحریر کر دوں گا، اب مجھے اور تشویش ہوئی کہ حضرت رائے پوری خیال فرمائیں گے کہ مقبول راز داری سے کام نہ لے سکا، اور اس خدشہ کو حضرت مدنی کے سامنے بھی پیش کر دیا، حضرت نے ازراہ شفقت

فرمایا کہ اچھا تحریر کردو کہ اس جمعہ کو انشاء اللہ قیام ہی ہوگا، اور مجھ سے فرمانے لگے کہ جانا بھی ہوگا تو نہیں جاؤں گا، جواب تحریر کردیا گیا، اور حضرت جمعہ کی صبح کو دیوبند تشریف فرما ہوئے اور اسی دن شام کی گاڑی پر سہارنپور واپسی ہوگئی۔"(۱)

بارہا اس کی نوبت آئی کہ حضرت مدنی کا کہیں سفر طے ہوا، پھر کسی وجہ سے اس کا التوا ہوگیا، آپ سہارنپور تشریف لائے اور حضرت شیخ الحدیث سے فرمایا کہ اتفاق سے یہ دن خالی ہوگیا ہے، چلو رائے پور ہو آئیں، شیخ فرماتے ہیں کہ دسیوں مرتبہ ایسا ہوا۔ (۲)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

شیخ فرماتے ہیں: میں نے اپنے اکابر میں بہت بے تابی سے رونے والا حضرت مدنی قدس سرہ اور اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کو دیکھا۔ (۳)

شیخ کا عقد ثانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی صاحبزادی مولانا محمد یوسف صاحب کی ہمشیرہ عطیہ صاحبہ سے ہوا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو معلوم ہوا، تو پیغام بھیجا کہ نکاح میں ہی پڑھوں گا، چنانچہ دہلی تشریف لائے، اور بعد نماز جمعہ نکاح پڑھایا۔ (۴)

شیخ کا ایک قدیم معمول اہم واقعات وحوادث، وفیات اور اپنے بزرگوں، احباب اور مخصوص خدام کی آمد و رفت، دور و سیر، نقل و حرکت کے قلم بند کرنے کا بھی تھا، جس کی حیثیت ایک مکمل و مفصل روزنامچہ کی سی ہے، اس روزنامچہ میں قمری و شمسی

---

(۱) مکتوب مولوی مقبول احمد صاحب، جامعہ رشیدیہ منٹگمری

(۲) سوانح رائے پوریؒ، ص: ۳۰۵-۳۰۷

(۳) سوانح شیخ الحدیث، از: مولانا علی میاں ندویؒ، ص: ۴۷

(۴) بحوالہ سابق، ص: ۲۰۷

سنہ و مہینہ اور تاریخ کی قید کے ساتھ گرد و پیش کے اہم واقعات درج ہیں، اسی کی مدد سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت رائے پوری اور سب سے بڑھ کر مولانا محمد یوسف صاحب کی سوانح مرتب ہو سکی، مولانا مدنی سے متعلق بھی اس میں بہت معلومات واندراجات ہیں۔ (۱)

شیخ کو سفروں سے صرف عدم مناسبت ہی نہ تھی، بلکہ ایک طرح سے وحشت واضطراب ہوتا تھا، جو بچپن سے لے کر جوانی تک کی تربیت اور حالات کا نتیجہ تھا، اور شاید اللہ تعالیٰ کو ان سے تصنیف و تالیف اور ارشاد و تربیت کا جو کام لینا تھا، اس کی حکمت و مصلحت کا بھی تقاضہ تھا کہ ان کو یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے، لیکن اس عزلت پسندی، یکسوئی کے ساتھ جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، مولانا مدنی، مولانا رائے پوری، اور مولانا محمد یوسفؒ کے ساتھ ضلع سہارن پور، میرٹھ، مظفر نگر، مرادآباد، بریلی، میوات کے چھوٹے چھوٹے سفر ان حضرات کی رفاقت اہم مدارس کے جلسوں، اور تبلیغی اجتماعات کی شرکت کے لیے وقتاً فوقتاً کرنے پڑتے تھے۔ (۲)

شیخ کو پے در پے ایسے سنگین و جان گداز حوادث وسانحات پیش آئے، جو طبیعت کو مستقل طور پر پژمردہ، پشت کو خم کر دینے اور سینے کو داغ داغ بنا دینے کے لیے کافی تھے، ۲۹/ شعبان ۱۳۹۳ھ کو اچانک عزیز نواسہ مولوی محمد ہارون کے انتقال کا واقعہ پیش آیا، جو ان کے ہی چشم و چراغ تھے، اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی بھی واحد یادگار، اس جواں سال اور ہونہار نواسہ کی وفات کی خبر شیخ کو مکہ معظمہ میں ہوئی، اس موقع پر راقم سطور نے شیخ کو جو تعزیت نامہ لکھا اس کے جواب میں شیخ کا جو گرامی نامہ آیا اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"مولانا! صدمات بہت اٹھا چکا، اب طبیعت ایسی بے حس ہو گئی کہ خوشی اور رنج دونوں ہی چیزیں میرے لیے مصنوعی سی رہ گئیں، "لکی لا تأسوا

---

(۱) بحوالہ سابق، ص: ۱۰۵ (۲) بحوالہ سابق، ص: ۱۱۱

علی ما فاتکم و لا تفرحوا بما آتاکم" کی سی کیفیت ہوگئی، حضرت سہارنپوریؒ، پھر چچا جان، پھر حضرت مدنی، حضرت رائے پوری، اور آخر میں عزیز یوسف مرحوم نے کچھ سیمنٹ کا سا پلاسٹر ایسا کر دیا کہ رنج وخوشی دونوں چیزیں وقتی میں رہ گئیں، جب دہلی یا سہارنپور سے کوئی خط وہاں کے متاثرین کے متعلق سننے میں آتا ہے تو ایک دم دو چار آنسو میرے بھی نکال ہی دیتا ہے، ویسے ہر وقت بحمد اللہ کوئی احساس نہیں ہوتا۔

ان حوادث وسانحات میں ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کو بھی شامل کرنا چاہیے، جس سے شیخ کو دہلی کے قیام میں بلاواسطہ سابقہ پڑا، اس فتنہ پرآشوب کی وجہ سے تقریباً چار ماہ تک شیخ نظام الدین میں گویا محبوس رہے، ۱۱/محرم الحرام ۱۳۶۷ھ کو مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے اور حضرت رائے پوری رائے پور سے سہارنپور تشریف لائے اور وہ تاریخی بلکہ تاریخ ساز مشورہ ہوا جس کے نتیجہ میں نہ صرف ان تین حضرات نے ہندوستان میں قیام کا فیصلہ کیا بلکہ ضلع سہارنپور، میرٹھ اور پورے مغربی یوپی کے علاقے کے مسلمان جمے رہے۔ (۱)

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے ساتھ ان کو جو خصوصی تعلق ومحبت اور اسی کے ساتھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ ان کی جو عقیدت وعظمت اس پورے دور اختلاف میں رہی وہ کسی جاننے والے سے پوشیدہ نہیں، ان کی تصنیف "الاعتدال فی مراتب الرجال" ان کے اس ذوق، اس جامعیت اور اس توسط واعتدال کا آئینہ ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا تھا، اور جس نے بارہا ان دینی گروہوں میں جو سب کے سب ایک ہی مرکز وایک ہی مسلک سے وابستہ تھے، وصل واتحاد کا بہت کام انجام دیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف مذاق کے لوگ اور

---

(۱) بحوالہ سابق، ص: ۱۱۹

مختلف مشائخ سے تعلق رکھنے والے اپنی علمی و عملی مشکلات کی الجھنوں کے موقعوں پر فیصلہ کن جنن ملتا۔ (۱)

حضرت شیخ باوجود اپنے بلند روحانی مقام، اور مرجع خلائق ہونے کے اپنے اہل تعلق کو اپنے وقت کے مستند و مسلم مشائخ بالخصوص شیخ وقت حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کی طرف اصرار و تاکید سے متوجہ فرماتے رہتے تھے، اور اس سے ان کی للّٰہیت، بے نفسی اور خلوص کا پورا اظہار ہوتا ہے، اس بار بار کے تاکید کی وجہ یہ تھی کہ شیخ تمام دینی و علمی و اصلاحی کاموں اور خود دعوت و تبلیغ کے لیے اخلاص و للّٰہیت، حیات قلبی اور حرارت باطنی کو ضروری سمجھتے تھے، جو ان کے نزدیک بمنزلہ اسٹیم کے تھی، جس کے بغیر دین کی کوئی گاڑی چلتی نہیں، بڑے اہتمام سے شیخ کا یہ مشورہ صرف اپنے خوردوں اور نیازمندوں ہی کے لیے نہیں تھا، خود بھی بڑے اہتمام سے رائے پور حاضر ہوئے، اور کئی کئی دن اور کئی کئی وقت رہتے۔

یہی حال حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی تشریف آوری کے موقع پر تھا کہ اطلاع ملنے پر رات کو جاگ کر اسٹیشن پر تشریف لے جاتے، اور وہ اہتمام و احترام فرماتے جو مشائخ کے ساتھ ہوا کرتا ہے، مولانا کے قیام دیوبند کے زمانہ میں بھی وقتاً فوقتاً وہاں تشریف لے جاتے، اور ملاقات کرتے۔ (۲)

ایک موقع پر شیخ نے فرمایا:

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ رگڑ جانے کے بعد

یہ ترمیم فرمائی ہے، گھس جانے کے بجائے رگڑ جانے سے، کہ حنا (مہندی) کی پتی جب رگڑ جاتی ہے تو وہ رنگین بنا دیتی ہے، اور اگر بغیر رگڑے ہوئے اسی کے پتے رکھ دیئے جائیں تو کچھ نہ ہوگا، حضرت مدنیؒ فرماتے تھے کہ مسجد اجابت میں میں ذکر کرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ اس کی دیواروں سے سر پھوڑ لوں۔ (۳)

---

(۱) حوالہ سابق، ص:۱۹۸-۱۹۹ (۲) ایضاً: ص:۲۱۵-۲۱۷ (۳) ملفوظ شیخ، بحوالہ سابق، ص:۲۵۹

مولانا شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالیؒ

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب مجددیؒ نے فرمایا:

”مولانا حسین احمد مدنی بھوپال تشریف لائے ہوئے تھے، تین روز کا قیام تھا، میاں (بڑے صاحبزادے مولوی محمد سعید صاحب) اوران کے ماموں خانقاہ تشریف لانے کی دعوت دینے کے لیے گئے، مولانا نے معذرت فرمادی کہ سب اوقات گھر چکے ہیں، اب کوئی وقت باقی نہیں ہے، دونوں ناکام واپس آگئے، میں نے کہا: تم بچے ہو، ابھی تمہیں کہنا نہیں آیا، میں گیا، حضرت آرام فرمارہے تھے، مجھے دیکھ کر اٹھنے لگے، میں نے کہا: نہیں، آپ آرام فرمایئے، مجھے صرف ایک مسئلہ پوچھنا ہے، میں دریافت کرتا ہوں کہ ایک شخص نے مسجد بنائی، وہ دروازے پر کھڑا ہوجاتا ہے، اور اندر آنے والوں کو روکتا ہے، مولانا نے فرمایا کہ جب وہ مسجد بنا چکا اور وقف کرچکا تو اب اس کو کیا حق ہے؟ میں نے کہا: آپ بھی مسجد ہیں، آپ نے اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کردیا ہے، اب جو چاہے آپ سے فائدہ اٹھائے، فرمایا: میں ضرور آؤں گا، لیکن کھانے کے بجائے چائے پر اکتفا کریں، میں نے عرض کیا کہ مجھے تو دوسرا ہی فائدہ اٹھانا ہے، میں پانی پلا کر رخصت کردوں گا، چنانچہ تشریف لائے، میں نے نظر بچا کر ان کی جوتیاں سیدھی کیں کہ عالموں کا احترام اللہ ورسول کی محبت کی دلیل ہے، اور وہ تو حدیث نبوی کے شیخ تھے، دیر رات تک حدیث کا درس دیتے تھے، اہل دنیا کو حال یہ ہے کہ ان کی محفل میں کھلبلی مچ جاتی ہے، اور کوئی دین دار آتا ہے تو کسی کی توجہ بھی نہیں ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نہیں۔ (۱)

مولانا سید طلحہ حسنیؒ

مولانا سید طلحہ حسنی ٹونکی بزرگان دیوبند کے اخلاص وللہیت کے بڑے قائل و

---

(۱) صحبتے با اہل دل، ص: ۲۰۲-۲۰۳

معترف تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا بڑے بلند الفاظ میں تذکرہ کرتے تھے، مولانا سید حسین احمد مدنی سے جو لکھنؤ میں ہمیشہ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرماتے تھے اور اس تقریب سے اکثر مولانا سید طلحہ صاحب سے صحبت و مجلس رہتی تھی، بڑی عقیدت و تواضع سے ملتے اور مولانا اکثر ان سے مزاح فرماتے۔ (۱)

---

(۱) پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ۲۴۰۔
مولانا سید طلحہ حسنی ٹونکی امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھانجہ سید محمد علی مرحوم صاحب مخزن احمدی کی اولاد میں ایک باکمال صاحب علم و فضل فرد تھے، مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے بعد کی ایک پوری جیل کے معلم و مربی تھے، اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر رہے اور لاہور کے قیام میں علامہ اقبال اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ساتھ اچھی صحبتیں اور مجلسیں رہیں، اور لکھنؤ کے قیام میں حضرت مدنی سے مناسبت اور عقیدت و محبت کا تعلق بڑھا۔ تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: پرانے چراغ جلد اول۔ (محمود)

ممتاز اصحاب علم وفضل کا تعلق بیعت وارادت

مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ

مولانا عبدالباری صاحب و برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب میں بڑے گہرے روابط وتعلقات تھے، دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں اور یہی مناسبت واتحاد کا ہمیشہ سے قوی ذریعہ رہا ہے، دونوں معاملات اور حقوق العباد میں بہت محتاط اور ذکی الحس واقع ہوئے تھے، دونوں مظاہر واشکال اور لوگوں کی تعریف وتنقید سے بے نیاز ہوکر شریعت کے حکم پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور فرائض، نفلی عبادتوں اور تکمیلی چیزوں پر ترجیح دیتے تھے، دونوں طبعاً ومزاجاً منتظم واقع ہوئے تھے، اور حساب کتاب کے صاف اور اس میں بے تکلف تھے، دونوں مولانا مدنی سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، ان مناسبتوں اور مشترک نقطوں کے باوجود تعلیم وتربیت، ماحول کے اختلاف اور خاندانی اثرات کی بنا پر دونوں میں بہت سی مابہ الامتیاز خصوصیتیں تھیں، اور جن کو خدا نے دو پیدا کیا ہے وہ کبھی ایک نہیں ہوسکتے، مولانا عبدالباری صاحب میں ایک حد تک شدت اور بے لچک پن تھا، وہ اپنے خلاف مزاج وخلاف اصول کسی چیز کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، اس وجہ سے ان کے چھوٹے اکثر ان سے خائف اور ان سے دور رہتے تھے، اور گھر کے کم افراد ان کے معیار پر پورے اترتے تھے، ان کی اسی مزاجی خصوصیت کو مولانا مدنی نے ایک مرتبہ اس بلیغ جملہ میں ادا کیا کہ "مولانا عبدالباری

چاہتے ہیں کہ شیطان مرجائے اور ایسا ممکن نہیں'' (۱)

ان کی بیعت اصلاً مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے تھی، اپنے رفیق خاص اور ہم سفر وہم مذاق مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم کے مقابلہ میں مولانا کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انہوں نے شیخ بیعت مولانا مدنی اور شیخ صحبت وتربیت مولانا تھانوی (۲) کے تعلق کو زیادہ جامعیت وتوازن کے ساتھ قائم رکھا اور مولانا تھانوی کی پوری عقیدت اور ذہنی وذوقی مناسبت کے ساتھ مولانا مدنی کی عقیدت وعظمت میں فرق نہیں آنے دیا، ان کے متعلق یہ مصرعہ پڑھا جاسکتا ہے ع

یوں کیے کس نے بہم ساغر وسنداں دونوں؟

اسی بنا پر مولانا مدنی ان کی کوٹھی پر کبھی کبھی رات گزارتے اور بڑے منشرح رہتے، مجھے بھی ایک دوبار اس کا اتفاق ہوا ہے، صبح کی آم خوری کی مجلس، صحن چمن میں چبوترہ پر نشست، شیخ وقت کی موجودگی، اور ایک چیدہ وبرگزیدہ مجمع اور اس کی شستہ وشائستہ گفتگو بھولنے والی چیز نہیں۔ (۳)

......جب مولانا عبدالماجد صاحب نے مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت واسترشاد کا تعلق پیدا کیا، میرے بڑے بھائی صاحب نے بھی اسی زمانہ میں مولانا سے تعلق پیدا کیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا گھر لکھنؤ میں مولانا کی مستقل فرودگاہ بن

---

(۱) پرانے چراغ، حصہ دوم، ص:۱۱۲

(۲) ان ارواح ثلثہ مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی میں فرق یہ تھا کہ اول الذکر دونوں بزرگ حضرت مدنی کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئے اور وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے، لیکن حضرت تھانوی نے بیعت کے لیے تو مولانا مدنی کو کہا اور تربیت کے لیے خود رضامندی ظاہر کی، اور اسی پر عمل ہوا، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب حیات عبدالباری، مطبوعہ مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ، البتہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا تعلق تھانوی مذاق کے باوجود مکمل طور پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے رہا۔ (محمود)

(۳) پرانے چراغ، حصہ دوم، ص:۱۰۷-۱۰۸

گیا، اس جدید روحانی رشتہ سے مولانا عبدالماجد صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی جلد از جلد زیارت ہونے لگی۔ (۱)

مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ

......جس دن سے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا قیام ہمارے مکان واقع گوئن روڈ ہونے لگا، مولانا محمد اویس صاحب (نگرامی ندوی) نے جلد ہی حضرت مولانا سے اصلاح وتربیت کا تعلق پیدا کرلیا اور بالآخروہ اجازت سے مشرف ہوئے۔ (۲)

مولانا (نگرامی) اگرچہ تمام تر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اور سلوک و تربیت میں مولانا سید حسین احمد مدنی کے دست گرفتہ اور ان کے دامن سے وابستہ تھے، اپنے سیاسی خیالات ومسلک میں بھی انہیں کے متبع تھے، لیکن ان کے اندر تنگ نظری، اور جماعتی عصبیت نہ تھی، وہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کے بڑے معتقد اور ان کی اصلاحی وتربیتی کوشوں اور ان کے نتائج کے بڑے قائل اور معترف تھے، لکھنؤ کے قیام میں ان کی مجالس میں نیاز مندانہ اور معتقدانہ حاضر ہوتے ان سے مراسلت بھی رہی تھی، حضرت کے متعدد خلفاء سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے، مولانا ہی کے ایک مسترشد مولانا نجم احسن صاحب جو عرصہ تک پرتا بگڈھ میں رہے، ان کے عزیز قریب اور ہم زلف تھے، مولانا کے مسترشدین میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی تو ان کے محبوب استاد اور مربی ہی تھے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری جب لکھنؤ تشریف لاتے اور دارالعلوم اور لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں ہفتوں قیام کرتے، تو مولانا کو اس اہتمام اور پابندی سے ان کی مجالس میں شریک ہوتے دیکھا کہ دیکھنے والا ان کو ان کا مرید رشید ہی سمجھتا، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے ان کو گہری عقیدت تھی، اور شیخ کو بھی ان سے تعلق خاطر تھا، ان کی وفات پر حضرت نے اپنے

---

(۱) پرانے چراغ، حصہ دوم، ص: ۱۳۰ (۲) پرانے چراغ، حصہ دوم، ص: ۲۲۳

گہرے رنج و تاثر کا اظہار کیا۔ (۱)

مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی رحؒ

مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا علمی ذوق اور علم میں فنائیت ہے، علم سے ان کو وہی تعلق تھا جو مچھلی کو پانی سے ہوتا ہے، علمی اشتغال رکھنے والے، تصنیف و تحقیق کرنے والے بہت سے مل جائیں گے، لیکن ایسے لوگ جو علم میں فنا ہوں، علم جس کا ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ بن چکا ہے، علم ہی ان کے لیے غذا اور شفا سب کچھ ہو، وہ مولانا نسیم احمد فریدی تھے، فریدی صاحب مرحوم کی دوسری خصوصیت ان کی سادگی، تواضع، فروتنی اور اخلاق ہے، مولانا مرحوم اتنی سادگی سے رہتے تھے کہ اجنبی آدمی دیکھ کر بالکل نہیں سمجھ سکتا کہ وہ بڑے عالم و مصنف ہیں، ہر شخص سے بہت تواضع و اخلاق سے ملتے تھے، موصوف شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد اور مسترشد، مرید و مجاز تھے، مولانا سے انہیں بڑی عقیدت و شیفتگی تھی۔ (۲)

---

(۱) پرانے چراغ، حصہ دوم، ص: ۲۲۹-۲۳۰ (۲) پرانے چراغ، حصہ سوم: ۲۱۹-۲۲۰

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے خلفاء و مجازین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے ۱۶۶ کی تعداد ظاہر ہوتی ہے، اور یہ اجازت خلفاء ۱۶۷واں نام ان کے خلف اکبر مولانا سید اسعد مدنیؒ کا نام مولانا فرید الوحیدی صاحب نے اپنی کتاب "شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ" میں صفحہ نمبر ۸۳۴ پر ذکر کیا ہے۔ یہ حضرت مدنی کے تذکرہ پر سب سے ضخیم اور مبسوط و مفصل سوانح ہے، جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تفصیلی مقدمہ ہے، اور کتاب ۸۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ (محمود)

ضمیمہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

سوانحی خاکہ

حضرت شاہ سید نفیس الحسینی صاحب علیہ الرحمہ
(۱۹۳۳ء-۲۰۰۸ء)
(خانقاہ حضرت سید احمد شہید، لاہور)

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی نابغہ روزگار شخصیت برصغیر پاک و ہند کا اعزاز، عالم اسلامی کا سرمایہ فخر و نیاز ہے، ان کی عظمت کا آفتاب یوم قیامت تک افق دہر پر جگمگاتا رہے گا، ذیل میں حضرت کا سوانحی خاکہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ ایک نظر میں اس ہمالۂ عظمت کا اندازہ کیا جاسکے:

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

ولادت باسعادت ۱۹/شوال ۱۲۹۶ھ

اوائل صفر ۱۳۰۹ھ:- دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔

۱۳۱۲ھ:- مولانا حافظ محمد احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم

نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ دار العلوم دیوبند کے مہتمم مقرر ہوئے، اور تا حیات یعنی ۱۳۴۷ھ تک عہدۂ اہتمام پر رونق افروز رہے۔

۱۳۱۶ھ:- از ۱۳۰۹ھ تا ۱۳۱۶ھ دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ۱۳۱۶ھ میں والد ماجد رحمہ اللہ کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کی، حضرت اقدس قطب العالم مولانا رشید احمد محدث گنگوہی قدس سرہ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا، ۲۴ یا ۲۵/ ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ کو مکہ معظمہ پہنچے، طواف قدوم سے فارغ ہو کر قطب عالم حضرت مولانا الحاج امداد اللہ تھانوی قدس سرہ کی بارگاہ عالی میں حاضری کا شرف حاصل کیا، ۲۵ تا ۲۶/ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ روانگی ہوئی۔

۱۳۱۷ھ:- محرم الحرام کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا، دیوبند سے رخصت ہونے کے وقت حضرت شیخ الہند نے پر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی تھی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے ایک دو طالب علم ہی ہوں چنانچہ مدینہ منورہ میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۳۱۸ھ:- شوال ۱۳۱۸ھ تک ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار طالب علموں کو پڑھاتے رہے، ذی قعدہ میں ۱۳۱۸ھ میں حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد محدث گنگوہی قدس سرہ کے ارشاد کے مطابق گنگوہ شریف کا سفر کیا۔

۱۳۲۰ھ:- میں ہندوستان سے واپس مدینہ منورہ پہنچے، اس وقت سے سلسلہ تعلیم بڑے پیمانہ پر جاری ہوا تو مدینہ طیبہ کے مدرسہ میں ملازمت، خارج از مدرسہ اوقات میں حرم نبوی میں کتابوں کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا، صبح کی نماز کے بعد، عصر کے بعد، مغرب کے بعد، بلکہ عشاء کے بعد بھی مختلف علوم و فنون کی کتابیں شروع کرا دیں۔

۱۳۲۳ھ:- قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی کا وصال۔

۱۳۲۴ھ:- مولوی احمد رضا خاں کا فتنہ، حسام الحرمین۔

۱۳۲۶ھ:- پہلی اہلیہ کا انتقال۔

۱۳۲۷ھ:- دار العلوم کا جلسہ دستار بندی (۱۶/۱۷/۱۸/ اپریل ۱۹۱۰ء)۔

۱۳۲۷ھ:- حضرت کی دستار بندی۔

۱۳۲۹ھ:- والدہ ماجدہ کا انتقال۔

۱۳۲۹ھ:- ہندستان سے واپسی حجاز۔

۱۳۳۱ھ:- ابتدائے سال میں حجاز سے تیسرا سفر ہندوستان، اواخر سال میں واپسی مدینہ منورہ، تیسری مرتبہ۔

۱۳۳۳ھ-۱۳۳۴ھ:- میں حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد قدس سرہ حجاز تشریف لے گئے، شریف حسین حاکم مکہ نے ترکی حکومت کے خلاف انگریزوں سے مل کر بغاوت کردی، شیخ الہند رحمہ اللہ کے مدینہ منورہ سے روانگی مکہ مکرمہ کے بعد حضرت مدنی کے والد ماجد اور بھائیوں سید احمد صاحب اور سید محمود صاحب کی گرفتاری ایڈریانوپل میں ان کی نظر بندی، والد ماجد ذات الجنب میں مبتلا ہوکر ایک ماہ بعد وفات پاگئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون) وہیں مدفون ہوئے۔

غازی انور پاشا اور غازی جمال پاشا کمانڈر انچیف محاذ مصر وحجاز سے حضرت شیخ الہند کی مدینہ منورہ میں ملاقات۔

۱۳۳۵ھ:- مکہ مکرمہ میں حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی گرفتاری پہلے جدہ اور پھر ۱۸/ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۴/ جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کئے گئے، حضرت مدنی بھی ساتھ تھے، سیاسی قید خانہ میں رکھے گئے، ۲۲/ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو یہ تمام حضرات شیخ الہند، حضرت مدنی، حضرت مولانا عزیز گل، مولانا حکیم نصرت حسین اور مولانا وحید احمد مدنی مالٹا روانہ کردیئے گئے، ۲۹/ ربیع الثانی کو جزیرہ مالٹا میں پہنچ گئے، تقریباً تین سال وہاں قید رہے۔

۱۳۳۷ھ:- قطب عالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری قدس سرہ کی وفات۔

۱۳۳۸ھ:- ۲۲/ جمادی الثانی کو رہائی ملی جس وقت ہندوستان تشریف لائے

اس وقت تحریک خلافت زوروں پر تھی، جو مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی وشوکت علی کی قیادت میں تحریک آزادی جاری تھی، ...... تحریک ترک موالات کا آغاز، شیخ الاسلام جامع مسجد امروہہ کی صدر مدرسی، شیخ الہند نے اپنے پاس بلا لیا، کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی ادارے میں تقرر۔

۱۳۳۹ھ:- شیخ الہند کی شدید علالت اور ۱۸/ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر وفات۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

سیاسی اجتماعات میں شرکت، مولوی بازار کلکتہ، ضلع ناگپور کے عظیم الشان جلسہ ہائے خلافت و جمعیۃ کی صدارت، سیوہارہ ضلع بجنور میں جمعیۃ وخلافت اور کانگریس کے عظیم جلسے ساتھ ساتھ ہوئے تو خلافت کے جلسے کی صدارت کے لیے آپ ہی کو منتخب کیا گیا، مظاہر علوم سہارنپور کے جلسے میں شرکت، کراچی کے مشہور جلسے میں شرکت، مسلسل اسفار اور سیاسی مصروفیات کے باعث آپ سے کلکتہ کی ملازمت نبھ نہ سکی، اور وہاں سے معاملہ ختم ہوگیا، ۱-۲-۳/ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ/ ۸-۹-۱۰/ جولائی ۱۹۲۱ء کراچی میں خلافت کمیٹی کے عظیم الشان جلسے جن میں مولانا محمد علی و مولانا شوکت بھی شریک تھے۔ شیخ الاسلام کی تجویز کہ انگریزوں کی فوج میں ملازم رہنا، بھرتی ہونا یا اس کی دوسروں کو ترغیب دینا حرام ہے۔

۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء):- حضرت شیخ الاسلام مدنی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر کچلو کے وارنٹ گرفتاری ۱۸/ ستمبر ۱۹۲۱ء، ۱۵/ محرم الحرام ۱۳۴۰ھ کو حضرت مدنی کی گرفتاری، ۲۶/ ستمبر سے مقدمہ کی کاروائی شروع، ۲۸/ ستمبر کو مولانا محمد علی کا بیان، مولانا محمد علی کے بیان کے بعد حضرت شیخ الاسلام کا بیان ہوا، ۲۹/ ستمبر کو عدالت میں بیان دیتے ہوئے مولانا محمد علی نے بڑھ کر حضرت مدنی کے قدم چوم لیے، حضرت شیخ الاسلام مع رفقاء سیشن سپرد۔

۲۴/ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو مقدمہ جوڈیشل کمشنر سندھ کی عدالت میں شروع ہوا، ۲۸/

اکتوبر کو حضرت مدنی کا بیان ہوا، کراچی کے زمانہ امارت میں مولانا محمد علی جوہر نے حضرت شیخ الاسلام سے ترجمہ قرآن مجید پڑھا، یکم نومبر ۱۹۲۱ء (۲۹/صفر ۱۳۴۰ھ) اس مشہور تاریخی مقدمہ کا فیصلہ، شیخ الاسلام اور آپ کے رفقاء کو دو دو سال قید با مشقت۔

۱۳۴۲ھ:- دسمبر ۱۹۲۲ء میں کوکناڈا میں جمعیۃ العلماء ہند کا عظیم الشان پانچواں اجلاس، حضرت شیخ الاسلام صدارت کے لیے منتخب ہوئے۔

۲۳ تا ۱۹۲۷ء:- تک سلہٹ کے جامعہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔

۱۳۴۶ھ:- میں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور ان کے رفقاء کے استعفے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے مشورے سے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند اور دیگر اراکین مجلس شوریٰ نے حضرت شیخ الاسلام کو عہدہ صدارت تدریس پیش کیا، آپ دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین بن گئے، تحریکات میں شرکت کا سلسلہ جاری رہا، جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کی ہر قسم کی جدوجہد میں قائدانہ حصہ۔

۱۳۵۱ھ (۱۹۳۳ء):- میں کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کی حکومت کے خلاف ستیہ گرہ، آپ جمعیۃ کے ڈکٹیٹر بنائے گئے، آپ کی گرفتاری۔

۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء):- ۸/جنوری ۱۹۳۸ء کی شب میں حضرت اقدس مدنی نے صدر بازار دہلی متصل پل سنگش میں ایک جلسے میں تقریر فرمائی، جس کا بڑا حصہ ۹/جنوری کے ''تیج'' اور ''انصاری'' دہلی میں شائع ہوا، چند روز کے بعد ''الامان'' اور ''وحدت دہلی'' نے اس تقریر کو قطع و برید کے بعد اپنے صفحات میں جگہ دی، ان پرچوں سے ''زمین دار'' اور ''انقلاب'' لاہور نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرت اقدس مدنی کی طرف منسوب کر دیئے کہ حسین احمد دیوبندی نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتی، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بھی اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں، اَوکما قال، جب یہ

اخباری اطلاع علامہ اقبال کے کان میں پڑی تو انہوں نے حضرت اقدس سے استفسار یا تحقیق کے بغیر چند اشعار سپرد قلم کر دیئے، ان اشعار کی بناء پر ہندوستان کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ ہو گیا جس کی تفصیل اس زمانے کے روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

حقیقت حال معلوم ہونے پر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنے ایک اخباری بیان میں اپنے تنقیدی اشعار سے رجوع فرمایا، لیکن نہ جانے "ارمغان حجاز" کے مرتبین نے پھر بھی کن مصلحتوں کے تحت وہ اشعار کتاب میں شامل کر لیے، علامہ کے بعض دوستوں اور ماہرین اقبالیات کی یہ رائے ہے کہ اگر یہ مجموعہ علامہ مرحوم کی زندگی میں چھپتا تو یہ اشعار اس میں شامل نہ ہوتے، علامہ اقبال مرحوم حضرت اقدس مدنی کے عقیدت مندوں میں سے تھے، چنانچہ فرمایا کہ "مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں"۔

۱۹۴۱ء:- حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب خرابی صحت کی بناء پر جمعیۃ العلماء کی صدارت کے لیے تیار نہ ہوئے، حضرت شیخ الاسلام جمعیۃ العلماء کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۲ء:- جون ۱۹۴۲ء میں خلاف قانون تقریر کے الزام میں گرفتاری، چھ ماہ قید بامشقت، پانچ سو روپے جرمانہ، چھ ماہ بعد قید میں توسیع، غیر معینہ مدت کے لیے نظر بند۔

۱۹۴۳ء:- ۲۴/ جنوری ۱۹۴۳ء کو مراد آباد جیل سے نینی جیل الہ آباد کو منتقلی، انیس ۱۹/ ماہ نظر بند، مدت اسیری ۲/ سال ۲/ ماہ، ۲۶/ اگست ۱۹۴۴ء کو رہا ہوئے، تحریک آزادی کا شباب، مسلم لیگ اور تحریک پاکستان، ہندوستان شدید ترین سیاسی بحران سے دوچار۔

ان نازک حالات میں حضرت شیخ الاسلام اور آپ کی جماعت کا موقف یہ تھا کہ کوئی ایسا فارمولا تسلیم نہ کیا جائے جس سے ہندوستان کے کسی مخصوص علاقہ کے باشندوں کو فائدہ پہنچے، اور دیگر حصہ میں ملک کے مسلم باشندے تباہی اور بربادی کا

شکار ہو جائیں، اس لیے مسئلہ کا حل اس طرح ہونا چاہیے کہ تمام علاقوں کے مسلمان باعزت طریقہ پر رہ سکیں، کیونکہ تقسیم ملک کی صورت میں مسلم اقلیت کا مسئلہ بدستور الجھا رہے گا، جب کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیت اس قدر موثر ہوگی کہ وہاں کی مسلم اکثریت ان سے متاثر ہونے پر مجبور ہوگی اور اگر تبادلہ آبادی کی نوبت آتی ہے تو نہایت تباہی وبربادی کے مناظر سامنے آئیں گے اور چونکہ ہندوستان میں مسلم اقلیت آٹے میں نمک کے برابر ہوگی اس لیے قطعاً غیر موثر ہوگی اور یہاں کی اکثریت اپنی من مانی کرنے میں آزاد ہوگی، آپ نے ایک جامع اسکیم پیش فرمائی جو ''مدنی فارمولا'' کے نام سے مشہور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱- مسلم اکثریت کے صوبہ دو تین امور کے علاوہ اپنے تمام معاملات میں خود مختار ہوں۔ ۲- مرکز کی تشکیل میں ہندو اور مسلم ممبران مساوی، اور دس سیٹیں پس ماندہ طبقوں کے لیے ہوں، اس طرح ہندو اور مسلمان ہر ایک کو ۴۵/ فیصد سیٹیں ملتیں، اسی کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ۳- کوئی قانون جس کا تعلق مسلمانوں سے ہوگا وہ اس وقت تک پاس نہ ہو سکے جب تک مسلم ممبران کی اکثریت اس کے حق میں نہ ہو اگر یہ فارمولا تسلیم کر لیا جاتا تو آج تمام ہندوستان مسلمانوں کے لیے پاکستان ہوتا۔

۱۹۴۷ء:- چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب کو برصغیر آزاد ہو گیا، ہندوستان تقسیم ہو گیا، پاکستان وجود میں آ گیا، اس کے بعد حضرت اقدس مدنی سیاسی ہنگامہ آرائی سے کنارہ کش ہو گئے، آزادی وطن کے حصول کی راہ میں سب کچھ کرنے اور سب کچھ سہنے کے باوجود جب زمام حکومت اہل وطن کے ہاتھوں میں آ گئی تو کسی مادی منفعت کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر خاموشی کے ساتھ میدان سے ہٹ گئے، صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے حکومت ہند کے پیش کردہ خطاب وتمغہ کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا، ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد آپ ہمہ تن درس وتدریس، ارشاد وہدایت اور احیائے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منہمک ہو گئے، اور جہاد اصغر سے فراغت کے بعد لوگوں کو تادم حیات جہاد

اکبر کا سبق پڑھاتے رہے، آپ نے ملک کے طول وعرض میں پے در پے دورے کئے، اور اپنی تقریروں میں مسلمانان ہند کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی تلقین فرماتے تھے، ہر ماہ رمضان المبارک آپ سلہٹ میں گذارتے تھے۔

۱۹۴۸ء:- فروری میں آپ نے جمعیۃ علماء صوبہ بہار کے سالانہ جلسہ بمقام سمستی پور ضلع دربھنگہ میں شرکت فرمائی، گجرات کے بھی آپ نے پے در پے دورے کئے۔

۱۳۷۵ھ - ۱۹۵۵ء:- میں آپ نے اپنا آخری سفر حج اختیار کیا، یہ سفر دو ماہ کا رہا، مدینہ طیبہ میں چالیس روز قیام رہا۔

۱۳۷۶ھ - ۱۹۵۷ء:- سال کے شروع میں جمعیۃ العلماء ہند کانفرنس میں حضرت نے شرکت فرمائی۔

۱۵/ ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۴/ جولائی ۱۹۵۷ء کو مدراس کا سفر اختیار فرمایا، طبیعت کی ناسازی کی بناء پر تمام چیزیں چھوڑ کر بروز جمعہ ۵/ محرم ۱۳۷۷ھ کو واپس دیوبند تشریف لے آئے، اس کے بعد مسلسل بیماری چلتی رہی، اسی دوران میں خانقاہ عالیہ رائے پور میں قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی ملاقات کو تشریف لے گئے ایک شب وہاں قیام فرمایا، ۲۸/ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵/ اگست ۱۹۵۷ء کو آپ نے اپنی زندگی کا آخری سبق بخاری شریف جلد اول سے پڑھایا۔

۱۳/ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء کو علم وعمل اور زہد وتقوی کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا۔

۱۹۲۰ء کی ابتداء سے ۱۹۵۷ء تک یعنی کامل ۳۵/ سال کا ایک ایک لمحہ تقوی، عبادت، ذکر وفکر، مراقبہ، اشتغال باللہ، جہاد فی سبیل اللہ، اعلان حق، مجادلہ بالباطل، اعلاء کلمۃ اللہ، احیاء دین، ترویج شریعت، اتباع سنت وتبلیغ دین، تلقین وارشاد، درس حدیث وتفہیم قرآن وغیرہ امور میں صرف ہوا، جس طرح لاکھوں بیمار آپ کے دم عیسیٰ سے شفایاب ہوئے، لاکھوں تشنگان علوم ظاہری وباطنی آپ کے دریائے فیض سے سیراب

ہوئے، وہ آج کی دنیا میں آفتاب کی طرح عیاں ہیں۔

تقسیم برصغیر کے بعد حضرت اقدس مدنی جس طرح مسلمانانِ ہند کے لیے دعا گو تھے اسی طرح پاکستان اور اہلِ پاکستان کے لیے بھی دل کھول کر دعائیں کرتے رہے، ثقہ روایت ہے کہ حضرت اقدس مدنی سے پاکستان کے بارے میں ایک مقام پر سوال کیا گیا تو فرمایا مسجد کی تعمیر سے پہلے اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ چھوٹی بنے یا بڑی، یہاں بنے یا وہاں بنے، نقشہ یہ ہو یا وہ ہو لیکن جب وہ بن کر تیار ہو جائے تو کوئی اختلاف کی گنجائش نہیں۔